Scanned by CamScanner

تین اناڑی

تین اناڑی

از

عصمت چغتائی

نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار
دہلی ۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ
بمبئی ۳

ستمبر ۱۹۶۰ء

بار اول ۱۰۰۰ قیمت: ایک روپیہ ۳۰ نئے پیسے

یونین پرنٹنگ پریس، دہلی

دو باتیں

اگر میں یہ نصیحت کروں کہ جھوٹ نہ بولو، بڑوں کا ادب کرو
اور جی لگا کر پڑھو تاکہ ایک دن لائق فائق بن کر اپنے ملک اور
قوم کا نام روشن کرو ——— تو میری لمبی چوڑی نصیحت بے کار
ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ تم جھوٹ نہیں بولتے، بڑوں کا ادب
بھی کرتے ہو اور پڑھتے بھی جی لگا کر ہو۔ لہٰذا ضرور ایک دن
کسی قابل بنو گے اور ملک کی خدمت کرو گے۔ تم مستقبل کے
معمار ہو۔

پھر بھلا تمھیں نصیحتوں کی کیا ضرورت ہے!

اس لیے میں تو یہی کہوں گی کہ تم اسی طرح شرارتیں کرتے
رہو۔ قہقہے لگاتے رہو۔ شریر بچے "عام طور پر ذہین ہوتے ہیں۔
اس لئے قدرتی طور پر ان کی شرارتوں سے کسی کی آنکھوں سے

آنسو بہانے والی حرکتیں سرزد نہیں ہوتیں۔ اُن کی شرارتوں
پر تو ہنسی آتی ہے۔ دلوں کے دُکھ دھیمے ہوتے ہیں۔
اس لئے میں تو تمھیں یہی رائے دوں گی کہ بوڑھے بھی
ہو جاؤ تب بھی ایسی ہی دل چسپ شرارتیں کرتے رہنا۔ یوں ہیں
ہنستے ہنساتے رہنا۔ اگر کسی کا نقصان نہیں ہوتا تو شرارتوں
سے زیادہ حسین کوئی حرکت نہیں۔
گگو! سب تمھیں کافی بد سمجھتے ہیں۔ تم ہو بھی خاصے بد۔
مگر یہاں اصل میں بد کے معنی شریر کے ہیں۔ لہٰذا تم بڑے
مزے سے بدی پر قائم رہ سکتے ہو۔ ذرا اس عادت کو اپنے
مستقبل کے فائدے میں استعمال کرنا شروع کر دو۔
بیلو! تم بھدیسلے ہو۔ مگر تمھارا دماغ تازی گھوڑی کی طرح
قلانچیں بھرتا ہے۔ اور تمھاری انگلیوں میں قوسِ قزح چھپی
ہوئی ہے۔ اُٹھ کر زمین کے چہرے سے میل کچیل اُتار کر
رنگ بکھیر دو۔ مزہ آ جائے گا!
ٹیٹو! تم سب سے چھوٹے ہو۔ مگر سب سے کھوٹے نہیں۔
یہ کافی حیرت کی بات ہے۔ دُنیا میں تم جیسے ہزاروں لاکھوں
ٹیٹو ہیں۔ اور جب میں اتنے بہت سے ٹیٹوؤں کا خیال کرتی
ہوں تو مجھے دنیا کے مستقبل پر رشک آنے لگتا ہے۔
جو شرارتیں آج تم کرتے ہو، وہی کل ہم نے بھی کی تھیں۔

اور وہ دن بھی ایک دن آئے گا جب یہی شرارتیں تمھارے
بچے کریں گے۔ انسان کی زندگی ایک درخت جیسی ہے۔
کلّہ پھوٹتا ہے ___ پودا پروان چڑھتا ہے۔ اس وقت وہ
بالکل اناڑیوں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ کبھی ایک طرف ٹیڑھا
ہونے لگتا ہے۔ کبھی دوسری طرف ضرورت سے زیادہ جھکتا
ہے۔ کبھی کسی کی دیوار سے اَڑ کر بڑھنے لگتا ہے۔ دیوار بھی
چٹختی ہے اور اس کا جسم بھی کُبڑا ہو جاتا ہے۔ اگر مالی ہوشیار
ہو تو وہ تم لوگوں کی طرح سینہ تان کر آسمان کی طرف اُٹھتا
چلا جاتا ہے اور ایک دن پھول اور پھل سے بار آور ہو کر دنیا
کو فیض پہنچاتا ہے۔

تم بھی بڑھتے ہوئے پودے ہو۔ اچھی سینچائی اور رکھوالی
نے تمھارا مستقبل روشن بنا دیا ہے۔ پھر اب میں تمھیں کیا
نصیحت کروں۔

تم خود میرے لئے بہت دل چسپ نصیحت ہو!

عصمت چغتائی

تینوں 'تاج اکبر' کی سیڑھیوں پر اُگتائے ہوئے بیٹھے تھے۔ گگو اپنے نئے جوتے کو ہزار بار چمکانے کے بعد صرف وقت کاٹنے کے لئے 'منن بھیّا کے پُرانے موزے سے گھِستے دے رہے تھے۔ ببلو کوئی نہایت بے سُری فلم کی ٹیون گنگنا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ گھٹنے پر ٹھیکا بھی دیتے جا رہے تھے۔ ٹیٹو سب سے نیچے کی سیڑھی پر بیٹھے اُس مکھّی پر جھلّا رہے تھے جو پِن پِن کر کے بار بار اُن کی چوکور ناک پر "ٹپّے" لگا رہی تھی۔ انھیں اپنی ناک کے وسیع ہونے کا ویسے ہی بہت غم تھا۔ اوپر سے یہ بدمذاق مکھّی ان کی ناک پر فٹ بال کھیل کر جیسے اور طعنے دے رہی تھی۔ کئی بار انھوں نے اُسے اپنی ناک کی پُھنگی پر آنکھیں بِھنگی کر کے دیکھا اور تاک کر گھونسا مارا۔ مگر وہ ہر دفعہ ایک لمحہ پہلے پُھدک کر پھر واپس آجاتی۔ ببلو اُن کی بے بسی پر مسکرا رہے تھے۔

"یار ٹیٹو یہ کمبخت مکھّی یوں نہیں مانے گی اس کے لئے

ایک چوہے دان کی قسم کا اک ایجاد ہونا چاہیے۔ مزے سے ناک پر رکھ کر سو جایا کرنا۔ جیسے ہی آئے گی پھٹاک سے مر جائے گی۔"
ٹیٹو ویسے ہی کھسیانے بیٹھے تھے۔ زور سے کہنی اُچھالی جو بیلو کی ٹھوڑی پر لگی اور اُن کی زبان کھُل گئی۔ گگو جو مزے سے بیٹھے اپنا جوتا چمکا رہے تھے، صورت حال کو امید افزا دیکھ کر فوراً اُدھر متوجہ ہو گئے اور بیلو کو ایسا ڈھلہ دیا کہ وہ پھسل کر ٹیٹو کی پیٹھ پر جم گئے۔ ایک دم جیسے سوئی ہوئی فضا نے انگڑائی لی اور وہیں سیڑھیوں پر تینوں گڈ مڈ ہو گئے۔

"ارے ارے جے کیا ہو را ہے جی۔" میوہ رام اندر سے غراتے ہوئے نکلے اور خود لڑائی کے بھنور میں اُلجھ کر اوندھے ہو گئے۔ اُن کے ہاتھوں میں جامنوں کی ٹوکری تھی وہ تینوں پر برس پڑی۔ ایک دم لڑائی ڈھیلی پڑ گئی اور دیکھتے دیکھتے جو جامنیں کچلنے سے بچی تھیں لوٹ لی گئیں۔

میوہ رام بہت بھنبھنائے۔ گو یہ جامنیں ان ہی کے لئے لائے تھے مگر اس طوفانِ بدتمیزی پر وہ بگڑ گئے۔ اور پیر پٹکتے بی آماں سے شکایت کرتے چل دیے۔

جامنیں کھانے میں تینوں ایسے جُٹے کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ جھگڑا کس بات پر ہوا تھا۔

اصل میں تینوں سخت بور ہو رہے تھے۔ امتحان ختم ہو گئے

تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کندھوں پر سے بھیگے ہوئے ریت کے بورے پھسل گئے۔ دو دن سے تینوں خالی ڈبوں کی طرح ادھر ادھر لڑھک رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کریں۔ تین مہینے کی چھٹیاں کیسے کاٹی جائیں۔ اگر لڑائی جھگڑا کیا تو ظاہر ہے سخت گندی ہوگی۔ گرمی کے مارے سب کا موڈ ویسے ہی خراب ہو رہا ہے۔

"کوئی ترکیب سوچنا چاہیے بھئی۔" بیلو نے تجویز پیش کی۔

"دو۔ تین۔ پانچ کھیلیں۔" ٹیٹو نے رائے دی۔

"ہٹو یار بور ہوگے دو۔ تین۔ پانچ سے۔" گگو بولے۔

"کوئی ڈراما کریں۔ ہیں؟"

"بھئی ہم نہیں کرتے ڈراما۔" ٹیٹو چیخنائے۔

"ٹیٹو صاحب آپ تو گدھے ہیں۔" گگو نے فیصلہ کیا۔

"جناب اتنا شاندار ڈراما ہوگا کہ کیا بتائیں۔"

"جیسے ممّی آپا وغیرہ دہلی فیسٹیول میں گئی تھیں ہم بھی جا سکتے ہیں۔ ایک دم فرسٹ کلاس ڈراما تیار کریں۔ ٹکٹ لگا کر کریں۔"

"ایں ہیں بھئی ہم نہیں خریدیں گے ٹکٹ۔" ٹیٹو بگڑے۔

"تم تو بے وقوف ہو۔ بھئی تم تو اس میں خود پارٹ کرو گے۔ تمھیں ٹکٹ تھوڑی لینا پڑے گا۔" بیلو نے کہا۔

"اور جناب کیا تعجب ہمارے ڈرامے کو انعام مل جائے۔" گگو نے پلان پھیلایا۔ "اور پھر ہم ڈراما کمپنی کھول لیں گے۔"

"ایں ہیں کچھ جو کھول پائیں اماں جو ماریں گی۔" یہ بزرگ کچھ جو کرنے دیں!

"جی ہاں کیوں ماریں گی اماں۔ کیوں گگو پھر شروع کر دیا یار۔" بیلو نے شوق سے آنکھیں چمکائیں۔

اب سوال یہ تھا کہ کون سا ڈراما کھیلا جائے۔ ہر کہانی میں کمبخت شہزادی ضرور ہوتی ہے۔ شہزادی کس کو بنایا جائے۔ عذرا پروین کے نخرے کون سہے۔ ویسے ان کے پاس عید کے لال جوڑے موجود ہیں اور جھل مل کرتی اوڑھنیاں بھی ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ الگ الگ پیدا ہو کر بھی دونوں جڑواں بنی رہتی ہیں۔ جہاں عذرا جائیں گی پروین بھی جائیں گی۔ جس سے عذرا لڑیں گی پروین فوراً اس کا منہ کھسوٹ لیں گی۔ اگر عذرا کنویں میں کود یں تو شرطیہ پروین بھی کود پڑیں گی۔ ایک کو شہزادی بناؤ تو دوسری روٹھ جاتی ہے۔ خیر روٹھ جائے بلا سے! مگر وہ تو عین رنگ میں بھنگ کرنے پر تُل جاتی ہے۔ بیچ ڈرامے میں سب کو چلا چلا کر بتا دیتی ہے۔ "اہا ہا۔ بالکل شہزادی نہیں بھنگن لگ رہی ہیں۔ شہزادی نہ شہزادی کی دُم۔ بڑی اترا رہی ہیں۔ لوگو یہ عذرا ہیں۔ عذرا چوٹّی میری گڑیا کا پجامہ چرایا تھا

انھوں نے "بس عذرا وہیں تاج واج پھینک کر لپٹ جاتیں یا پروین پر چیل کی طرح جھپٹ کر اُن کی چوٹی نوچ ڈالتیں۔ پروین کوئی دبنے والی تھیں؟ بس وہیں نیولے اور سانپ کی لڑائی ٹھن جاتی۔ منتظمین اور دوسرے کلاکار اُن کی لپیٹ میں آ کر گودڑ کی طرح اُلجھ جاتے۔ پھر نوکر اور آیائیں آجاتیں۔ ان کا بھی بیچ بچاؤ کرنے میں بُھرتا بن جاتا۔ اس طرح جس ڈرامے میں عذرا پروین کو لیا جاتا وہ ہمیشہ ٹریجڈی پر ختم ہوتا تھا۔

لٰہذا گگو نے فیصلہ کیا کہ کوئی لڑکی ڈرامے کے آس پاس نہ پھٹکنے دی جائے۔ وہ خود ہی شہزادی بھی بنیں گے اور شہزادہ بھی اور اگر ضرورت پڑی تو کالا دیو بھی بن جائیں گے۔ مگر جب اُنھیں تجربے کے طور پر دوپٹہ اوڑھایا گیا تو بالکل چمگادڑ کی طرح ہونق لگنے لگے۔ اُن کے بڑے بڑے کان دوپٹے میں سے کھونٹیوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ اُن کی صورت دیکھتے ہی ببلو کو ہنسی کا دورہ پڑا تو ڈراما کمپنی قریب قریب ٹوٹ گئی۔ گگو بُرا مان گئے اور دوپٹہ پھینک کر غمگین بیٹھ گئے۔

بڑے سوچ بچار کے بعد طے ہوا کہ ڈرامے کے درمیان میں شہزادی انگور کھائے گی۔ لٰہذا تینوں شہزادی بننے پر مصر ہونے لگے۔ ظاہر ہے اگر تینوں شہزادیاں بنا دی جاتیں تو بادشاہ، کالا دیو اور بہادر سپاہی کون بنتا؟ ویسے چوبدار، مہامنتری

اور فوج کی خدمات بھی انھیں تین اداکاروں کو باری باری انجام دینا تھیں۔ پہلے گگو چوبدار بن کر بادشاہ کے آنے کا اعلان کرتے تھے۔ پھر جلدی سے پردے کے پیچھے جاکر بڑے کیپ جس میں صوفی آکر[1] نے چاکولیٹ کی پنّی کے پھول بناکر لگادیئے تھے پہن کر بادشاہ سلامت بن کر آجاتے تھے۔ان کے پیچھے ہنسی روکنے کے لیئے ناک دبائے بیلو وزیر اعظم بنے آتے تھے۔ پھر مکالمے چلتے تھے۔ اور بیلو "جی حضور" اور "جی شہنشاہ" کے علاوہ سارے مکالمے بھول جاتے تھے۔ بار بار گگو کو دبی زبان سے اُن کے مکالمے یاد دلانے پڑتے تھے۔ دو تین دفعہ "ایں؟ ایں؟" کرنے کے بعد اُنھیں مکالمہ یاد آتا۔

اُدھر ٹینٹو شہزادی کی طرح خراماں چلنے کے بجائے بھد بھد کرتے آتے اور فوراً بولتے۔

"انگور حاضر کیئے جائیں"۔ انھیں آتے ہی انگور کی فکر پڑجاتی۔

"ارے بھئی ابھی نہیں"۔ گگو بگڑ جاتے۔

"واہ جناب کیوں نہیں؟" ٹینٹو بگڑتے۔

"اونہہ بھئی پہلے شہزادی اسٹیج پر آتی ہے، شہنشاہ کو سات سلام کرتی ہے"۔ اسٹیج ڈائرکٹر بیلو جھلّا اٹھے۔ کتنی دفعہ انھوں نے ٹینٹو کو سمجھایا کہ شہزادی کو بار بار بھول کر پیچھے یا آٹھ

---

[1] خالہ کو آکہ کہتے ہیں۔

سلام نہیں کرنے چاہئیں۔ سلام کرنے کے بعد شہزادی مکالمہ بولتی ہے۔ پھر انگور مانگتی نہیں بلکہ کنیز لاتی ہے تو پہلے انکار کرتی ہے پھر بڑی مشکل سے تھوڑے سے کھاتی ہے۔ جلدی جلدی سب نہیں بھکس لیتی۔

مگر ٹیٹو حیران تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شہزادی اتنی گدھی کیسے ہو سکتی ہے کہ انگور کھانے سے جھوٹ موٹ کو بھی انکار کرے۔ ان کا خیال تھا۔ شہزادی اسٹیج پر آتے ہی انگوروں کی فرمائش کرے اور نہایت تیزی سے کھا جائے اور ڈراما ختم ہو جائے بس!

ریہرسل میں انگور تو نہ ملے۔ لہٰذا چنوں اور بسکٹوں سے کام چلایا گیا۔ مگر شہزادی پھر ڈائیلاگ بھول گئی اور آتے ہی بولی۔

"انگور حاضر کیے جائیں۔"

"نہیں جناب ابھی سے انگور نہیں ملیں گے۔ ڈائیلاگ تو ختم ہوا نہیں۔" گگو بھنّائے۔

"اری واہ. بول تو دیا تھا ڈائیلاگ۔" ٹیٹو منمنائے۔

"ایں ہیں کب بولا تھا جھوٹے۔" وزیر اعظم یعنی بیلو بولے۔

"اُنہہ بھئی ابھی تو بولا تھا۔ نہیں تو پھر بول دیں گے۔ انگور کھانے کے بعد۔"

"ایں بیں گدھے بعد میں کیسے بولوگے۔ ڈائیلاگ بولو تب ملیں گے انگور"! گگو بادشاہ کی کرسی سے چلاّئے۔

اتنے یہ بحث چل رہی تھی بیلو اُکتا کر بسکٹ چکھنے لگے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ سارے بسکٹ چکھ ڈالتے۔ شہزادی اور شہنشاہ کی نظر وزیر اعلیٰ کی اِس حرکت نازیبا پر پڑگئی۔ اور ڈائیلاگ وغیرہ بھول کر دونوں بسکٹوں پر ٹوٹ پڑے۔ اور دم بھر میں بسکٹ ختم ہوگئے۔

اس دن ریہرسل ملتوی کرنا پڑا کیوں کہ ٹیٹوؔ کو ڈرامے کا صرف ایک حصّہ دل چسپ معلوم ہوتا تھا۔ یعنی بسکٹوں سے ریہرسل۔ اُن کی تو ساری دل چسپی ختم ہوگئی۔

شہزادی کے کپڑوں کا سوال بھی بہت ٹیڑھا تھا شہنشاہ تو اپنی کارڈرائے کی پتلون اور اچکن پہن کر اوپر سے بی اماں کا ایک گھُنا ہوا دوشالہ اوڑھ لیتے تو نہایت شاندار بادشاہ بن جاتے۔ پنّی کا پھول لگا ہوا تاج موجود ہی تھا۔ بیلو آکہ[۱] کی پُرانی ساڑھی کا پگڑ باندھ کر وسیم بھائی کی مہندی کی ریشمی اچکن پہن لیتے تھے اور فرسٹ کلاس وزیر اعظم بن جاتے تھے۔ مگر ٹیٹوؔ کے ڈریس کی مصیبت تھی۔ عذرا نے اپنا نازک اطلس کا

۱؎ خالہ کو آکہ کہتے ہیں۔

پاجامہ دینے سے قطعی انکار کردیا۔ ٹینٹو کی موسل جیسی ٹانگوں کے خیال سے ہی پھریریاں آتی تھیں۔ خوبصورت گوٹے کا غرارہ دو منٹ میں تار تار ہو جائے گا۔ اگر گھوڑے کو غرارہ پہنا دیا جائے تو اس بدنصیب غرارے کی زندگی کتنے منٹ کی رہ جائے گی! لہٰذا پروین کی ایک نہایت سڑیل سی شلوار ملی۔ جو ٹینٹو کے گھٹنوں سے بھی کچھ اونچی تھی اور اُن کے کھُردرے اونٹ جیسے گھٹنے اور بھی بھدّے لگنے لگے۔ کمّی آپا کی ایک جھلسی ہوئی پُرانی شلوار اتنی لمبی تھی کہ اُسے پہن کر بالکل پاموز مُرغی لگنے لگے۔ وہ ان کے پیروں سے ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت بڑی تھی۔ خیر اس سے ایک فائدہ ہوا کہ اُن کے بھدّے بوٹ اُتارنے کی ضرورت نہ تھی۔ آسانی سے شلوار سے ڈھک گئے۔ ریہرسل والا جالی کا دوپٹہ کمّی آپا نے دُھلنے دے دیا تھا۔ زبیدہ آپا کا ایک دو بالشت کا نائیلان کا دوپٹہ خوش قسمتی سے ہاتھ آگیا۔ بی اماں کی پنڈلیوں میں جب بائنٹے پڑتے تھے تو وہ کس کر اس دوپٹے سے باندھ لیا کرتی تھیں۔ آئیڈکیس کی تھوڑی تھوڑی بدبو آتی تھی تو ایسا کیا اندھیر تھا۔ شلوار میں سے بھی تو سڑے ہوئے چاولوں کا بھبکا نکل رہا تھا۔ کُرتے کا سوال بڑی آسانی سے حل ہو گیا۔ کلّو بُوا کا گلابی آنکھ کے نشے کا کُرتا جس میں نیلی جھالریں لگی تھیں مل گیا۔ یہ کُرتا رائے عامّہ سے مجبور ہو کر انھوں نے بقچیا میں

سینت کر رکھ دیا تھا۔ کیونکہ جب وہ یہ کُرتا پہن کر اپنی کوٹھری
سے طلوع ہوتی تھیں تو بی اماں اور خالہ آماں کو ہول اُٹھنے
لگتا تھا۔ بیچاری کلّو بُوا کو یہ کرتا ازحد لاڈلا تھا۔ اُن کے تیسرے
میاں نے بڑے چاؤ سے دلّی سے اُن کے لئے بنوا کر بھیجا تھا۔
اُسے پہن کر اپنے خیال میں وہ قطعی دُلھن لگنے لگتی تھیں۔
اب ٹکٹ بیچے جانے لگے۔ سب سے پہلے صوفی آلہ کے
پاس ڈیپوٹیشن گیا۔ خوب رُعب گانٹھا گیا کہ ازحد شاندار ڈراما
ہونے والا ہے۔ بیچ بیچ کے انگور ہوں گے وغیرہ وغیرہ ان کے
ہاتھ ٹکٹ بھی بیچا گیا اور ڈونیشن بھی لیا گیا۔ اس کے بعد
وسیم بھائی کو گھیرا گیا۔ پہلے تو وہ بہت بدکے۔ انھیں تو قاعدے
سے پاس ملنا چاہئیں۔ مگر سکندر بھابھی نے چار ٹکٹ چار چار آنے
والے خرید لئے۔
اور بڑے زور شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ چبوترے پر
تخت بچھا کر اسٹیج بنایا گیا۔ گھر بھر کی جتنی کرسیاں اور مونڈھے
تھے جمع کر کے سامنے سجائے گئے اُن کے پیچھے پلنگ بچھا دئے
گئے اور سرِ شام ہی سے پبلک جمع ہونے لگی۔ عذرا اور پروین
اب پچھتا رہی تھیں کہ کیوں ڈرامے میں حصّہ نہیں لیا۔ مزے سے
پیسے ملتے اور انگور کھانے کو ملتے سو الگ۔ مگر اب پچھتانے
سے کیا ہوتا تھا۔

لیکن جب پیروں سے ڈیڑھ بالشت آگے نکلی ہوئی شلوار اور
کلّو بُوا کا کُرتا پہن کر ٹیٹو شہزادی کے روپ میں اپنے ٹیڑھے
میڑھے دانتوں کو نکوسے ہوئے جلوہ افروز ہوئے تو صوفی آکہ
اور کمّی آپا اتنا ہنسیں کہ کُرسیوں پر سے نیچے لڑھک گئیں۔ ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ ٹیٹو صاحب کلّو بُوا کے بقچیا سے سیدھے
نکلے چلے آرہے ہیں! دوپٹہ اوڑھنے سے ان کی ناک اور بھی
چوکھونٹی لگنے لگی۔ صوفی آکہ نے بڑی مشکل سے ہنسی کا دورہ
روکا اور فیصلہ کیا کہ "ہمارے ٹکٹ کے دام واپس کرو۔ ہم
نہیں دیکھتے اتنا سڑیل ڈراما۔ ٹیٹو قطعی شہزادی نہیں لگ رہے
ہیں۔ موٹی قصائینی لگ رہے ہیں!"

موٹی قصائینی سے ٹیٹو کے پتنگے لگتے تھے۔ جب آتی تھی
کم بخت انھیں چھیڑتی تھی۔

"اے ٹیٹو میاں ہم سے بیاہ کروگے؟" اور ٹیٹو کو پھر سارا گھر
اتنا چھیڑتا کہ وہ پکّا ارادہ کرلیتے کہ ایک دن وہ موٹی قصائینی
کو قتل کرکے خود ہنسی خوشی سولی پر چڑھ جائیں گے۔ پھر
کوئی نہ چھیڑے گا۔

مارے غصّے کے ٹیٹو میاں بھر گئے۔ وہیں کھڑے کھڑے
سب کپڑے نوچ کے پھینک دیے اور انتقاماً انگور کی
پلیٹ پر ٹوٹ پڑے۔ گگو اور بیلو کے میک اپ کے ماہر

میوہ رام بوٹ پالش سے موچھیں بنا رہے تھے۔ انھوں نے جو
انگوروں پر غنیم کو حملہ کرتے دیکھا تو پگڑ اور تاج پھینک پھانک
خود بھی دوڑ پڑے اور انگوروں کی حفاظت میں ٹینٹو سے زیادہ
تیزی سے انگور کھا ڈالے۔

حاضرین جو پہلے ہی ڈرامے سے ناخوش تھے اس ٹریجڈی
پر بالکل ہی بکھر گئے۔ اور ٹکٹوں کے پیسوں کی واپسی کے لئے
غل مچانے لگے۔ چونکہ زیادہ تر ٹکٹ اُدھار بکے تھے اور باقی
پیسوں کے انگور اور ریہرسل کے لئے بسکٹ اور چنے آچکے تھے
لہٰذا پیسے واپس کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ ڈراما بڑی طرح
فلاپ ہوگیا۔ تُو تُو میں میں سے بڑھ کر بات ہاتھا پائی تک
پہنچ گئی۔ بیلو نے گگو کو دھکا دیا۔ گگو سمجھے ٹینٹو نے دھکا دیا ہے۔
انھوں نے ان کے ٹیپ جڑ دی۔ ٹینٹو نے گھما کر ایک مکا گگو
کی ناک پر ٹسکا دیا۔ بس پھر کیا تھا! تین جوڑی ہاتھ اور پیر ایسے
خلط ملط ہوگئے کہ یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ کون سا ہاتھ
کس کا ہے۔ صوفی آکہ اور میوہ رام نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش
میں سارے خالی وار اپنی ناکوں پر وصول کئے۔

اتنے میں گرجتی برستی آکہ میدانِ کارزار میں کود پڑیں۔ اور
بغیر پوچھے گچھے لڑتے بھنبوڑتے انبار کو سنٹی لے کر دھنک کر
رکھ دیا۔ آکہ کی عادت ہے یونہی اچانک میدان میں پھاند پڑتی

ہیں، یہ نہیں پوچھتیں کس کا قصور تھا۔ بس ایک سرے سے سب کے پیٹ دیتی ہیں۔ قصوروار اور بے قصور سب ہی پٹ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے اس میں مجرم کو بھی سزا مل ہی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بے قصور بھی اتنا ہی یا کچھ زیادہ پٹ جاتا ہے۔ تو بھئی گیہوں کے ساتھ گھُن تو پِس ہی جاتا ہے۔

"آگ لگے اللہ ماری ڈراما کمپنی کو"۔ بی اماں نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر پھر کسی فرد نے ڈراما اسٹیج کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنا سر پھوڑ کر گھر سے نکل جائیں گی۔ تینوں اُداس پھر تاج اکبر کی سیڑھیوں پر جاکر بیٹھ گئے۔ ساری اسکیم پر ٹیٹو صاحب نے پانی پھیر دیا۔

●

ڈراما کمپنی کی دل شکن ناکامی کے بعد کئی دن تینوں بجھے بجھے سے رہے۔ مُن بھیّا اور کمی آپا کو اگر صوفی آکہ نہ ڈانٹتیں تو وہ انھیں خود کشی کر لینے پر مجبور کر دیتے۔ چھٹیوں پر نہ جانے کس منحوس کی پرچھائیں پڑ گئی تھی کہ ہر اسکیم پٹ ہوئی جارہی تھی۔ عجب مصیبت تھی بیڈ منٹن کھیلو تو گیند سیدھی تاک کر پانی کے مٹکے میں یا بی اماں کے کتھے کی کُلھیا میں گرتی۔ کرکٹ کھیلو تو ہِٹ سیدھا کھڑکی یا دروازے کے شیشے پر جا بیٹھتا۔ آنکھ مچولی کھیلو تو چھپو کہاں۔ کمّی آپا فوراً اپنے پلنگ کے نیچے سے مچھّر دانی کے بانس مار مار کر نکال دیتیں۔ بی اماں کے کمرے میں جاؤ تو انھیں فوراً ہول چڑھنے لگتا۔ مجیب بھائی کے کمرے میں جانا سراسر موت کو دعوت دینا ہے۔ فوراً پکڑ کر الجبرا اور جومیٹری رٹانے لگیں گے۔ وسیم بھائی کے کمرے میں چھپو تو وہ فوراً چلّا چلّا کر اعلان کر دیں گے۔

"بھئی ہمارے کمرے میں کوئی نہیں چھپا ہے۔ یہاں کوئی ڈھونڈنے نہ آئے" امیر خاں کے باورچی خانے میں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ رہ گئی کلّو بُوا کی کوٹھری تو وہاں چھپنا بڑے دل گُردے کا کام ہے۔ اوّل تو گندھک، گلقند اور مختلف مرہموں کا بھبکا ناک میں چڑھ کر چھکّے چھڑا دے گا دوسرے مچھّروں کے قبیلے کے قبیلے حملہ کر کے چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ میوہ رام کے کمرے میں جانا بھی دردِ سر مول لینا ہے۔ یہ بدمذاق شخص ہر وقت شریف آدمیوں کی میلی ناکوں پر نظر رکھتا ہے۔ ویسے بھی چاہے کتنی صاف ہو ناک، احتیاطاً ناک صفا کرنے کی رائے دے دے گا۔ کہو بھئی کسی کی ناک اُجلی ہے کہ میلی آپ کو کیا تکلیف ہوتی ہے۔ کسی کی گردن پر میل کی پپڑیاں ہیں تو آپ کی بلا سے۔ لوگ کہتے ہیں میوہ رام بہت اچھا نوکر ہے۔ ہُنہ نوکر! ان تینوں کی جان کو تو وہ دوزخ کے داروغہ کی طرح لگ چکا ہے۔ پیدا ہوتے ہی رُعب جمانا شروع کر دیا اور برابر ہر وقت اینٹھتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر نہایت غیر ملازمانہ حرکتیں، گُستاخی سے سب کے سامنے ڈانٹنا اور موقع بے موقع چپتیا دینا۔ نہ جانے امّاں نے اس ظالم کو اتنی چھوٹ کیوں دے رکھی ہے۔ آخر نوکر پہ آقاؤں کا کچھ رُعب تو ہونا چاہیئے۔ یہ کیا کہ یہاں اُلٹی آقاؤں کی اِس جلّاد نوکر سے

کتنی دبتی ہے۔ اور یہ حق تلفی صرف اس لئے ہوتی ہے کہ یہ تینوں مختار نہیں۔ جو لوگ پیسا کماتے ہیں وہ خود مختار ہوتے ہیں۔ وہ چاہے رات بھر فلاش کھیلیں، نسکار کے پروگرام بنائیں۔ اونچے اونچے قہقہے لگائیں۔ میوہ رام دوڑ دوڑ کر چائے اور شربت سے اُن کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔ اور یہاں جب تیسری سے چوتھی پلیٹ مانگو تو ٹکا سا جواب مل جاتا ہے۔ "بس بس کیا ہیضہ کرو گے کمبختوں" دنیا جانتی ہے کہ ہیضے کے جراثیم آئیس کریم میں نہیں بلکہ بھنڈی، لوکی اور ٹنڈوں میں ہوتے ہیں۔ مگر یہ منحوس ترکاریاں زبردستی لگائی جاتی ہیں کہ ان میں نہ جانے کون کون سے وٹامن ہوتے ہیں حالانکہ ان بیہودہ ترکاریوں کے بجائے ہر شریف وٹامن کو صرف ٹافیوں، گلاب جامنوں اور رس گلّوں میں ہی ہونا چاہئے تھا۔

"اپنی روزی کسی طرح خود کمائی جائے۔" گگو نے سنا تھا کہ خالہ اماں وسیم بھائی کو اس لئے کھریدتی رہتی ہیں کہ وہ وہ اپنی روزی خود نہیں کماتے۔ جو کما کر لاتے ہیں ان کے بڑے لاڈ کئے جاتے ہیں۔

"مگر کیسے؟" بیگو سے کوئی دو۔ تین۔ پانچ کھلوا لے مگر ڈلیا ڈھونے کے کام سے اس کی جان نکلتی ہے۔ بھد یسلہ ہے نا!

"جناب دولت کمانے کے لکھوکھا طریقے ہیں"۔ گگو نے پیارے ماموں کا جملہ دُہرایا۔ "اگر کہیں سے تھوڑا سا گڑ مل جائے تو۔"

"گڑ؟" بیلو کی آنکھوں میں رونق آگئی۔ دادی اماں کو گڑ سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ "بس زیادہ گڑ مت کھاؤ پیٹ خراب ہو جائے گا۔"

کہو بھلا پیٹ نہ ہو گیا روئی کا پھویا ہو گیا کہ پاؤ ڈیڑھ پاؤ گڑ سے بگڑ بیٹھے گا۔

"گڑ چنے کی ٹافی بنائی جائے"۔ گگو نے تشریح کی۔

"ٹافی بنے گی تو چکھنا تو پڑے ہی گی"۔ ٹیٹو نے تخیل میں ٹافی چکھ کر چٹخارہ لیا۔ "پھر؟"

"پھر یہ کہ ٹافی کی چھوٹی چھوٹی پڑیاں باندھ کر بیچی جائیں۔ اس سے جو منافع ہو تو اور گڑ خریدا جائے، اور ٹافی بنائی جائے۔" یہ گگو پکا بنیا ہے کسی دن ٹاٹا اور برلا کا دیوالہ نکال کر چھوڑے گا۔ کیا کیا "گر" میں لڑاتا ہے۔

"پھر جناب ٹافی کی دکان کھولی جائے، ہیں نا"۔ ٹیٹو چہکے۔

"جی ہاں، دکان سے کیا ہو گا پورا کارخانہ کھولا جائے۔ پھر سارے ہندوستان میں ٹافی بیچی جائے"۔

مگر سوال یہ تھا کہ گڑ کہاں سے ملے۔ بی اماں تالے میں رکھتی ہیں شکر اور گڑ۔

"بس ایک ترکیب کی جائے"۔ گگو عرف لال بجھکڑ بولے۔

"کیا؟"

"ہر گھر میں جاکر تھوڑا گڑ مانگا جائے"۔

"اماں یار جوتے کھلواؤ گے۔ ہماری تو اماں اتنا ماریں گی کہ کٹلیٹس بنا دیں گی"۔

"جی ہاں کیوں ماریں گی۔ یوں تھوڑی مانگیں گے کہ کسی کو پتا چلے۔ ٹیٹو جائیں بیگم اماں کے پاس اور کہیں تھوڑا سا گڑ دید یجیے۔ بی اماں نے مانگا ہے۔ اور بیلو تم جاؤ بی اماں کے پاس کہ بیگم اماں نے گڑ مانگا ہے۔ اس طرح اماں اور آگے سے دادی اماں اور خالہ اماں سے الگ الگ جاکر گڑ مانگا جائے"۔

"قیصر خالہ سے بھی"۔ ٹیٹو نے آنکھیں چمکائیں۔

"ہاں اور افسر آپا اور زرینہ آپا سے بھی"۔

"زرینہ آپا بڑی کائیاں ہیں جاتے ہی کہیں گی: "میرا بھیا کیسا پہلے میری چپلی میں کیل ٹھونک دے"۔ پھر کہیں گی" ذرا میری کتابوں پر کاغذ تو چڑھاؤ"۔ جب جاؤ ہزاروں کام بتادیتی ہیں۔ اور گڑ دینے کے نام پر بولیں گی۔ نہیں بھائی، ہم گڑ کے پیپے میں ہاتھ نہیں ڈالیں گے ہمیں چپچپا لگتا ہے"۔

اتنی مخالفت کے خوف کے باوجود اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ گڑ مانگا جائے۔ بیلو نے نہایت مسمسی سی صورت

بنائی، چلے خالہ اماں کے پاس۔

"خالہ اماں بی اماں نے کہا ہے ذرا سا گڑ دید تیجئے۔ گڑ کے ٹکڑے پکیں گے۔"

"گڑ؟...... اوئی، کیسا گڑ" خالہ اماں چکرائیں۔

"جی گڑ... گڑ" بیلو اس سے زیادہ گڑ کی تشریح نہ کر سکے۔

"اے لڑکے دیوانہ ہوا ہے کچھ اور مانگا ہوگا۔ پرسوں ہی تو میں نے سوا چار سیر گڑ اکبر سلطان کو بھیجا ہے ختم بھی ہوگیا۔"

"جی بالکل ختم ہوگیا" بیلو بڑی بھولی آواز میں بولے۔

"اے بوا سکندر زمانی ذرا سا گڑ دے دو...." گڑ تو مل گیا مگر خالہ اماں نہایت جز بز ہوگئیں "اے سرتاج زمانی سنتی ہو، اکبر سلطان کے ہاں سوا چار سیر گڑ چٹکیوں میں اُڑ گیا۔"

"نوکروں نے چرایا ہوگا" سکندر زمانی بولیں۔

ادھر جب ٹیٹو بی اماں سے خالہ اماں کے لئے گڑ مانگنے گئے تو وہ از حد چراغ پا ہوئیں "لو منّی آپا بھی حد کرتی ہیں۔ سنا ہے مارہرے سے وسیم بیس سیر گڑ لائے ہیں۔ ایسا ہی تھا تو بانٹنے کا ہے کو بیٹھ گئی تھیں۔ کلّو بوا پھینک آؤ اللہ مارا گڑ، ہمیں نہیں چاہیے۔" بی اماں بگڑ گئیں۔

"بی اماں وہ کہتی ہیں ہمارے گڑ میں چوہیا نے بچے دیدئے ہیں اس لئے تھوڑا سا گڑ دید تبجے۔" ٹیٹو نے بات سنبھالی۔

"ہے ہے اللہ کی پھٹکار چوہیا نامراد کی صورت پہ۔ اے بی اختر سنتی ہو...... منّی آپا کے گڑ میں چوہیا نے بچے دے دئے۔ میرا سارا مشروع کا گٹھنا کھا گئی حرامزادی۔"

"کون بی اماں"۔ بی اختر ساڑھی پر پتی کا کام کرنے میں بالکل بے ہوش ہو جاتی ہیں۔

"اے وہی قطامہ چوہیا۔ میں کہتی ہوں یہ سکھٹی کا بچہ کس کرم کا ہے۔ ڈھائی سیر اناج کھانے کو چوکس، چوہیا مارتے دم نکلتا ہے۔ اے ہے یہ مونڈی کاٹی بلّی کس مرض کی دوا ہے۔ کیا مجال جو ایک بھی چوہیا مار جائے۔"

"نہیں بی اماں ہماری ماو چوہے نہیں مارے گی۔ ہمیں گندے لگتے ہیں کمبخت چوہے۔" کمی آپا بولیں۔

"ہاں ہاں تمھاری بلّی تو نواب زادی ہے۔ چوہے نہیں مارے گی۔ تخت پر بیٹھی گلاب کے پھول سونگھتی رہے گی۔ نفرت ہے مجھے مٹلّو سے۔" بی اماں جل گئیں۔

اب ٹیٹو کھڑے کسمسا رہے ہیں۔ بات گڑ سے چوہوں پہ کودی۔ اور چوہوں سے کمی آپا کی نخریلی بلّی پر اور وہاں سے بی اماں کی پٹاری میں لڑھک گئی۔ کاش چوہیا کے بجائے

کوئی اور ہی بہانہ کیا ہوتا تو یہ ذرا سی بات تبنگڑ نہ بن جاتی۔
گڑ مانگنے کی اسکیم میں کچھ گڑ بڑ ہوگئی۔ بھولے سے گگو بھی دوبارہ بی اماں سے گڑ مانگنے آگئے۔ وہ پہلے ہی گڑ کے ذکر پر چڑھی بیٹھی تھیں۔ اسی وقت امیر خاں سے کہا لے جاکر منّی آپا کے ہاں پٹخ آؤ گڑ۔ ہمیں نہیں چاہئے۔ منگائے جارہی ہیں تو بھیجا کیوں تھا۔
اگر سے جب گڑ مانگا تو وہ ایک دم بھنّا اٹھیں۔
"کہہ دو آپا سے خالہ اماں سے منگالیں۔ ہم نہیں دیتے۔"
گڑ کی مہم کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ کہیں سے تو اتنا مختصر گڑ ملا کہ دوسرے ٹھکانے پر پہنچتے پہنچتے ٹیٹو میاں نے راستے ہی میں چکھ ڈالا۔ گو جن جن اڈّوں پر پہنچے کسی نے گڑ کے معاملے میں جوش و خروش نہیں دکھایا۔ بہت ہی تھوڑا سا جمع ہو پایا۔ بلّو نے جس جیب میں گڑ رکھا اس میں اتفاق سے پہلے سے کباڑ خانہ موجود تھا۔ کچھ زنگھیائی ہوئی ٹیڑھی کیلیں۔ خالی کارتوس، مختلف رنگ اور وزن کے پتھر، چند کینچوے اور نیم مردہ مینڈک کے بچّے۔ جو انھوں نے مچھلی کے شکار کے خیال سے جمع کئے تھے۔ کچھ خوش رنگ پر۔ یہ سب چیزیں گڑ کے شیرے میں لتھڑ کر اتنی بھیانک ہوگئی تھیں کہ گڑ کی ٹافی کے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

خیر جتنا بھی گڑ جمع ہو سکا غنیمت سمجھا گیا۔ اب یہ فکر ہوئی کہ امیر خاں باورچی خانہ چھوڑ کر ذرا کلّو بُوا سے باتیں مٹھارنے جائیں تو کچھ ٹافی وغیرہ پکائی جائے۔ چنانچہ جونہی امیر خاں ہانڈی اُتار کر ذرا کلّو بُوا سے اُن کے چوتھے شوہر کی شراب پی کر ٹھکائی کرنے کی عادتِ بد پر تبصرہ کرنے پہنچے تینوں نے باورچی خانے پر حملہ بول دیا۔ نہ جانے بہت سی پتیلیوں میں کیا کیا کچھ کھد بدا رہا تھا۔ یونہی تجربے کے طور پر دو چار ہانڈیاں چکھ ڈالیں۔ ایک اندھیری سی گہری پتیلی میں نہ جانے کیا اُبل رہا تھا۔ بیٹو صاحب کی عینک تو بی امّاں کی پٹاری میں ٹانگیں اونچی کئے لیٹی تھی۔ ٹھیک سے سوجھا بھی نہیں۔ جونہی ایک چمچہ بھر کر سُڑّپا مارا کھانستے اوکتے نالی کی طرف دوڑے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا اس نا ہنجار پتیلی میں میلی صافیاں اور جھاڑن اُبالے جا رہے تھے۔ خیر کلّی کر کے ذرا سی گڑ کی ڈلی تالو میں چپکائی تب کہیں جا کر جھاڑنوں کا ذائقہ حلق سے نیچے کھسکا۔

کوئی ٹھیک پتیلی خالی نہ تھی۔ اس لئے ایک بڑے سے پتیلے میں ہی پکانے کا ارادہ کیا۔ پیندے میں ذرا سا گڑ پڑتے ہی کھد بد کرنے لگا۔ ادھر تینوں چمچے چھیلے اور ایک دوسرے کو چمچے پھانکنے سے روکنے میں ایسے غرق ہوئے

کہ بی اماں کی ناک میں جب گڑ جلنے کی بو پہنچی تو انھوں نے ہانک لگائی۔

"اے ہے امیرا کے بچے! یہ بورچی خانے میں کیا تیرا کلیجا جل رہا ہے اور تو بیٹھا کلو بوا سے چونچلے بگھار رہا ہے۔"

ٹافی سازوں کے آئے جواس گم ہو گئے۔ بیلو نے گرم پتیلا چھوا اور بلبلا کر بھاگے۔ گگو ہڑ بڑا کر اپنے کرتے کے دامن سے پتیلا پکڑ کر جو اٹھانے جھکے تو جیب میں بھری ہوئی سیپیاں گھونگے، بینچ کش، ربڑ، پنسل، اٹیچی کی کنجی وغیرہ گڑ میں گر گئیں۔

بڑی مشکل سے امیر خاں نے آکر پتیلا اتارا۔ زمین پر رکھتے ہی جلا ہوا گڑ مع کباڑ کے پیندے میں سیمنٹ کی طرح جم گیا۔ گڑ کے جلنے سے پرانے پتیلے کا پیندا کچھ ایسا ناکارہ ہو گیا کہ اس پر قلعی نہیں ٹکتی اور جب بی اماں نانا ابا کے فاتحے کا پلاؤ بگھارنے بیٹھتی ہیں ٹافی سازوں کی نئے سرے سے آفت آجاتی ہے۔

تینوں کی گڑ مانگنے کی اسکیم بھی پوشیدہ نہ رہ سکی اور ہفتوں کورٹ مارشل ہوتا رہا۔ بے چارے خاموش سر جھکا کر ملامتیں سنتے ہیں۔ اور غم کھا کر رہ جاتے ہیں۔ اگر کہیں ٹافی کی اسکیم خاطر خواہ بیٹھ جاتی، گڑ کافی ملتا، پتیلا اتنا بڑا نہ ہوتا تو مزا آجاتا۔

منافع در منافع ہوتا۔ بینک بیلنس بڑھتا۔ اور آج یوں پھٹکاریں سُننے کے بجائے ایک نہایت شاندار بنگلے میں تینوں ٹھاٹ سے رہتے۔ پھر آتاں یوں جھانوے سے گئے" کیوں چھیلتیں نہ آکہ سود در سود کے سوال رٹاتیں نہ مجیب بھائی مولیاں بواتے اور نہ میوہ رام ہر وقت جیبوں کی تلاشی لینے کی ہمّت کرتے۔ اُف کتنے عیش ہوتے!

اب تو تینوں کو اپنے پورے طور پر اناڑی ہونے کا یقین ہونے لگا۔ چھٹیاں چیونٹی کی چال رینگ رہی تھیں۔ خیر ایک سہارا تھا کہ آموں کی افراط تھی۔ تینوں اپنی مخصوص بیٹھک یعنی "تاج اکبر" کی سیڑھیوں پر بیٹھے سامنے بالٹی رکھے آم چوس رہے تھے۔ اتنے میں وسیم بھائی بوکھلائے ہوئے تیزی سے آئے اور سیڑھیوں پر پھٹ پھٹ کرتے چڑھ گئے۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اُتر آئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے گیٹ تک گئے۔ سارس جیسی گردن نیوڑھا کر باہر کسی کو دیکھا اور ایک دم اُچھل کر بھاگے۔ اُن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ پسینے کی لمبی لمبی ڈوریاں چہرے پر پھسل رہی تھیں۔ پاجامہ کچھ زیادہ ہی گجا ہو رہا تھا۔ غرض یہ کہ پریشانی اور گھبراہٹ کا چلتا پھرتا اشتہار بنے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا وسیم بھائی؟" انھیں پھر سیڑھیوں پر لپکتے ہوئے

بیلّو نے پوچھا۔ وہ ایک دم ٹھٹک کر گرتے گرتے بچے۔

"دیکھو کوئی آدمی آئے اور پوچھے وسیم صاحب کہاں ہیں تو کہہ دینا مارہرہ گئے ہوئے ہیں۔" انھوں نے کھسیا کر کہا۔

"کیوں؟" ٹیٹو نے آم کی گٹھلی زور سے سڑک پر گزرتے ہوئے کتے کی ٹانگ میں ماری۔ وہ بیں بیں کرتا ہوا جھاڑیوں میں گھس گیا۔

"کیا بات ہے وسیم بھائی؟" بیلّو کو چھپی چھپوّل میں وسیم بھائی کی چلّا کر کہہ دینے کی عادت یاد آگئی کہ "ہمارے کمرے میں کوئی نہیں چھپا ہے۔ یہاں کوئی نہ آئے۔"

"ہم جھوٹ نہیں بولتے۔" گگّو نے صاف جھوٹ بولا۔

"آپ تو گدھے ہیں۔ معلوم ہے کون تین دن سے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔" وسیم بھائی نے رازداری سے اُکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کون؟ سلطانہ ڈاکو۔" گگّو بولے۔

"اس سے بھی زیادہ خطرناک آدمی ..... انکم ٹیکس افسر!"

"انکم ٹیکس کیا ہوتا ہے یار بیلّو۔"

"کیوں وسیم بھائی انکم ٹیکس کیا ہوتا ہے۔"

"اماں یار نہایت بیہودہ چیز ہوتی ہے اب تمھیں کیا بتائیں جرمانہ ہوتا ہے۔" وسیم بھائی کرا ہے۔

"جرمانہ!... اور جو نہ دو تو؟"

"جیل میں سڑو۔" غم غلط کرنے کے لئے انھوں نے بالٹی میں سے ایک موٹا سا آم پکڑا مگر ابھی پلپلا ہی رہے تھے کہ کوئی آدمی سائیکل پر سوار پھاٹک میں داخل ہوا۔ وسیم بھائی بغیر چک اُٹھائے بم کے گولے کی طرح اندر گھس گئے۔ آم سمیت! تینوں نہایت بے اعتباری سے نو وارد کو دیکھنے لگے۔

"ظفر منزل کو کون سا راستہ جاتا ہے میاں۔" سائیکل سوار نے سیڑھیوں پر پیر لٹکا کر پوچھا۔

"کیوں؟ کیا کام ہے... کیوں پوچھ رہے ہو۔ گگو بھڑکے۔

"ویسے ہی مجھے کریم صاحب سے ملنا ہے۔" وہ بولا۔

"جھوٹ بول رہا ہے... اصل میں یہ وسیم بھائی کی تاک میں ہے۔" گگو نے بیلو کے کان میں کہا۔

"کیا تم انکم ٹیکس افسر ہو۔" ٹیٹو بھونڈے پن سے بولے۔

"نہیں صاحب میں تو رئیس میاں کا نیا نوکر ہوں۔ بیگم صاحب نے بڑا پتیلا منگوایا ہے۔ کھچڑا پکائیں گی۔"

"تو تم انکم ٹیکس افسر نہیں ہو؟" بیلو نے حسرت سے پوچھا۔

"نہیں تو صاحب، یہ انکم ٹیکس کیا ہووے ہے؟"

"ارے تم کیسے آدمی ہو انکم ٹیکس نہیں جانتے! جرمانہ ہوتا

ہے، بیچارے وسیم بھائی پر کر دیا گیا ہے۔"

"ارے رے یہ تو بُری بات ہوئی صاحب! پھر؟"

"پھر یہ کہ وسیم بھائی اندر چھپ کر بیٹھے ہیں کہ پکڑے نہ جائیں۔" گگو نے تشریح کی۔

ان تینوں کو خبر ہی نہ ہوئی باتوں میں لیسے لگے کہ ایک آدمی سائیکل پر آیا اور کھڑا ہو کر اُن کی باتیں سننے لگا۔

"تو صاحب ظفر منزل کدھر ہے۔" رئیس میاں کے نئے نوکر نے پوچھا۔

"ادھر سیدھے چلے جاؤ سامنے ..." بیلو بتانے لگے۔

"ارے نہیں نہیں۔ ادھر بھول کر بھی نہ جانا ادھر سے تو انکم ٹیکس والا آجائے گا۔ وسیم بھائی کہہ رہے تھے۔"

بھولا سا نیا نیا نوکر گھبرا گیا۔ "مگر صاحب میں نے تو کچھ کیا نہیں ہے۔ مجھ پر کا ہے کو لگا دیں گے ٹیکس۔"

"کچھ کرنے سے تھوڑی لگتا ہے ٹیکس۔ وسیم بھائی تو بیچارے کبھی کچھ کرتے ہی نہیں۔ پھر بھی ان پر ٹیکس لگ گیا۔"

"تو میں کیا کروں صاحب۔ یہ بھی کوئی اندھیر ہے۔ کچھ کرو نہ تب بھی ٹھک جاوے جریانہ۔"

"وسیم صاحب کہاں ہیں۔" نئے آدمی نے سائیکل کھڑی کر کے

پوچھا۔

"شی اتنی زور سے اُن کا نام مت لو...... وہ انکم ٹیکس والے کی وجہ سے اندر چھپ کر بیٹھے ہیں۔" ٹیپو بولے۔ "تم نے سڑک پر آتے میں کسی خطرناک شخص کو تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں......" وہ آدمی مسکرایا۔ "تو وسیم صاحب اندر ہیں۔ ذرا بلا دیجئے صاحبزادے۔"

"جاؤ ٹیپو.... بلا لاؤ۔"

"ارے واہ ہم کیوں جائیں۔" ٹیپو آموں پر جُٹے رہے۔

"بیلو یار تم ہی بلا لاؤ۔" گگو نے زور دیا۔

"ارے وسیم بھائی...." بیلو نے مارے سُستی کے ہانک لگائی۔ "وسیم بھا۔آ۔آ۔آئی ـــــ"

وسیم بھائی پہلے سے بھی زیادہ دکھلائے ہوئے نکلے اور نئے سائیکل سوار کو دیکھ کر اُن کی پنڈلیاں لرزنے لگیں۔

"آداب عرض ہے وسیم صاحب کہیے سب خیریت ہے؟" وہ مسکرایا۔

وسیم بھائی نے کھا جانے والی نظروں سے تینوں کو گھورا۔ مگر کچھ بول نہیں سکے۔

"سکندر زمانی سے کہہ دینا میں انکم ٹیکس کے دفتر جا رہا ہوں۔" انھوں نے رقت بھری آواز سے کہا۔

"ارے وسیم بھائی ـــ" تینوں ہکا بکا دیکھتے رہ گئے، اور انکم ٹیکس والا مسکراتا ہوا انھیں ساتھ لے کر چلا گیا۔

"یار غضب ہو گیا۔ مارے گئے۔ بچارے وسیم بھائی"، بیلو نے کہا۔

"کیا گولی سے مارے جائیں گے بچارے"، ٹیٹو خوف زدہ ہو کر بولے۔

"اماں ہٹاؤ یار نرے گاؤدی ہو تم۔ گولی وولی نہیں ماری جائے گی مگر بیچارے وسیم بھائی بہت رپٹائے جائیں گے"، بیلو افسردہ ہو گئے۔

"کیوں؟" ٹیٹو نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

"بھئی انکم ٹیکس جو نہیں دیا انھوں نے"۔

"اُنہہ بھئی یہ انکم ٹیکس کیا ہوتا ہے ہماری بالکل سمجھ میں نہیں آتا"۔

"آپ تو گدھے ہیں، ارے انکم ٹیکس کیا ہوتا ہے یہ بھی نہیں جانتے"۔ گگو حقارت سے ہنسے "ذرا آپ کو دیکھئے اتنے بڑے ڈھونگڑے ہو گئے یہ بھی نہیں معلوم کہ انکم ٹیکس کیا ہوتا ہے"۔ حالانکہ بیلو کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا کہ انکم ٹیکس کیا بلا ہے۔ اور اُنھیں پکا یقین تھا کہ گگو صاحب زبردستی اینٹھ رہے ہیں۔ اُنھیں بھی کچھ پتا نہیں۔ مگر وہ اُن سے اس وقت لڑائی نہیں مول لینا چاہتے تھے۔ کل ہی اُنھوں نے ایک نئی تصویر بنائی

تھی۔ اگر گگو کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوجاتی تو وہ فوراً اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیتے۔

"آہا جناب کچھ جو اچھی ہو یہ تصویر۔ ایسی تو بکری بھی اپنے کھُر سے بنا سکتی ہے۔ وہ اپنے پتلے اونچے اونچے کان پھڑ پھڑا کر فرماتے۔ اور بیلو کا دل سلگ کر کوئلہ ہوجاتا۔ جی چاہتا تصویر کو کھرچ کر پھینک دیں۔

"ایں ہیں آپ کو جیسے معلوم ہے۔" ٹیٹو کھسیانے ہوگئے۔

"اور کیا جناب کیا ہم آپ کی طرح پھسڈی ہیں؟"

"کچھ جو معلوم ہو، گگو صاحب بن رہے ہیں۔" بیلو جل کر منمنا ہی دیئے۔

"معلوم کیسے نہیں۔" گگو غرّائے۔ ابھی وسیم بھائی نے بتایا جو نھا کر جرمانہ ہوتا ہے۔ جو کوئی جرمانہ نہیں دیتا سپاہی آکر اُس کی کڑکی کر لیتا ہے۔"

"یہ سپاہی تھا جو ابھی وسیم بھائی کو لے گیا؟"

"اور نہیں تو کیا کدّو تھا۔" گگو نے مُنہ چڑایا۔

"جناب وردی کیوں نہیں پہنے تھا۔" بیلو نے ٹانگ کھینچی۔

"کیوں پہنے وردی؟ خفیہ پولیس کا سپاہی تھا۔" گگو بولے۔

لفظ خفیہ سُن کر ٹیٹو کو ڈھاٹے بندھے ڈاکو کھچا کھچ تلواریں

چلاتے نظر آنے لگے۔ خفیہ اور پُر اسرار چیزیں نہایت خطرناک ہوتی ہیں۔

"مگر کا اماں پر کیوں نہیں ہوتا جرمانہ" بیلو گگو کے سامنے عموماً زیادہ عقل کی بات کہتے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ اُسے اپنی ذاتی ہتک نہ سمجھ لیں۔

"جی ہاں اماں کے ڈنڑ دیکھے ہیں۔ کوئی کُشتی لڑے تو صفا ہار جائے" ٹینو نے اطلاع دی۔ "جناب ہماری اماں اتنی نگوڑی ہیں کہ خفیہ پولیس کا آدمی بھی کتراتا ہے اُن سے۔"

"اصل میں عورتوں سے ٹیکس نہیں لیا جاتا۔" گگو بولے۔ ان کا خیال تھا کہ امائیں اور دادیاں نانیاں اتنی غضیل ہوتی ہیں کہ ہر وقت نوکروں کو۔ بچوں کو۔ مرغیوں کو۔ بطخوں کو۔ مہترانی کو۔ ہوا کو۔ آندھی کو ڈانٹتی ہی رہتی ہیں۔ ایک مسلسل ڈانٹ ہے جو کسی نہ کسی کے سر پر برستی ہی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کوئی بھی ہوشیار آدمی اُن سے اُلجھنا نہیں پسند کرے گا۔

"تو جناب پھر خالہ اماں کیوں دیتی ہیں ٹیکس" بیلو پیدائشی وکیل ہے۔ بے کار کو ہر بات میں مین میکھ نکالے چلا جاتا ہے۔

"کچھ نہیں۔ سب غلط ہے۔ گگو صاحب آپ کو کچھ جو معلوم ہو۔ آپ بن رہے ہیں" ٹینو اُلجھ کر بھنا اُٹھے۔

"ٹینو صاحب آپ نے زیادہ بدتمیزی کی تو ٹھک جائیں گے،

ہاں۔" گگو نے اپنا رعب خاک میں ملتا دیکھ کر دھمکی دی۔

"ارے واہ کیوں ٹھک جائیں گے؟ ہم بھی آپ کی شکایت کردیں گے کہ آپ نے مجیب بھائی کے کتّے کے ڈھیلا مارا تھا۔"

"کہہ کہاں مارا تھا۔ جھوٹے۔"

"تم خود جھوٹے۔"

اور اس سے پہلے کہ تینوں گتھ جاتے اُدھر سے صوفی آکہ بھٹکتی ہوئی آن پہنچیں۔ تینوں نہایت مہذّب اور معصوم صورتیں بناکر بیٹھ گئے۔ صوفی آکہ کو مار پٹائی سے سخت خوف آتا تھا۔ جہاں ذرا دھکم دھکا مذاق میں بھی تینوں نے شروع کی اور انھوں نے رپٹایا اپنے کمرے سے۔ صوفی آکہ کو ناراض کرنے کا مطلب تھا کہ ان تمام چاکلیٹوں اور ٹافیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا جائے جو وہ آئے دن بانٹا کرتی تھیں۔ اس معاملے میں تینوں قطعی اناڑی نہیں تھے۔ چنانچہ فوراً پینترا بدل کر بھولی بھولی صورتیں بنالیں۔

"صوفی آکہ آپ کو بھی جرمانہ دینا پڑتا ہے۔"

"کیسا جرمانہ؟" صوفی آکہ چکرائیں۔

"انکم ٹیکس کا۔"

"انکم ٹیکس...... ارے بھئی انکم جرمانہ نہیں ہوتا۔"

"ایں؟....... مگر صوفی آکہ....." ٹیٹو ہکلائے۔

"ہے بیوقوف انکم ٹیکس کہیں جرمانہ ہوتا ہے۔" گگو چالاکی سے ہنسے۔

"صوفی آکہ ٹیٹو بالکل گھونچو ہیں۔"

"آں؟ ہم کیوں ہوتے گھونچو آپ خود ہوں گے۔ جناب ابھی تو کہہ رہے تھے جرمانہ ہوتا ہے پولیس کا آدمی آتا ہے۔ پکڑ کر لے جاتا ہے۔" ٹیٹو چنچنائے۔

"ارے واہ ہم تو کہہ بھی نہیں رہے تھے۔ ٹیٹو صاحب جھوٹ بول رہے ہیں۔ دیکھئے، صوفی آکہ پھر ہم انھیں ماردیں گے۔" ایک دم گگو مدّعی بن بیٹھے۔

"ابھی ابھی تو کہہ رہے تھے! ہیں نا بیلو؟" ٹیٹو نے ناک پھلائی۔

بیلو کو معلوم تھا کہ گگو صفا جھٹلادیں گے۔ اُن کے خلاف گواہی دینے میں سراسر نقصانات ہیں۔ بات ٹالنے کے لئے وہ لمبی لمبی جمائیاں لینے لگے۔ پھر ایک دم بولے۔

"تو صوفی آکہ وسیم بھائی انکم ٹیکس والے کو دیکھ کر کیوں سٹپٹا گئے۔"

"وہ..... بھئی کوئی بات ہوگی۔ روپئے نہیں ہوں گے۔" صوفی آکہ کترائیں۔

"اور خفیہ پولیس کا آدمی۔" ٹیٹو نے پوچھا۔

"اُونہہ کیسا خفیہ پولیس کا آدمی" صوفی آلہ چڑھ کر جانے لگیں۔

"تم لوگ اوندھی باتیں کرتے ہو"

"اچھی صوفی آلہ" تینوں چمٹ گئے۔

"بھئی ہمیں پڑھنا ہے"

"اُونہہ بس ہر وقت پڑھے جاتی ہیں" تینوں کی سمجھ میں قطعی یہ بات نہیں آتی تھی کہ کسی کو خواہ مخواہ پڑھے جانے کا بھی شوق ہوتا ہوگا۔ اماں آلہ یا مجیب بھائی کے خوف سے کوئی شریف آدمی پڑھنے پر مجبور ہو جائے تو وہ اور بات ہے۔ مگر یہ کیا کہ بس خود بخود پڑھنے کا شوق کئے چلے جا رہے ہیں۔

"دیکھو بھائی جیسے مکان میں رہنے کا کرایہ ہوتا ہے ایسے ہی ایک ملک میں رہنے کا کرایہ ہوتا ہے"

"ارے واہ ہم تو نہیں رہیں گے کسی ملک میں۔ بیکار کو کیوں کرایہ دیں۔ ہم تو ہمیشہ تاج اکبر میں رہے چلے جائیں گے"

"جی ہاں بڑے تاج اکبر میں رہے چلے جائیں گے نکال دیا جائے گا آپ کو" گگو ہمیشہ معاملے کو بگاڑ دیتے ہیں۔

"واہ کیوں نکال دیا جائے گا۔ ہم تو نہیں نکلیں گے" ٹینٹو اکڑے۔

"تاج اکبر میں رہو یا شاہین ولا میں یا کوئی مکان لے کر رہو، ملک میں تو رہو گے۔ اور جس ملک میں رہو گے وہاں کی گورنمنٹ

کو ٹیکس دینا پڑے گا۔ ہر ایک کو اپنی آمدنی پر ٹیکس دینا پڑتا ہے۔" صوفی آگہ بولیں۔

تینوں کے چہرے فق ہو گئے۔ یہ اچھی زبردستی ہے۔

"کیا سب سے ٹیکس لیا جاتا ہے؟" ٹیٹو نے سہم کر پوچھا۔ اگر ان کی عیدی پر ٹیکس لگ گیا تو بھوسا بھر جائے گا۔ ویسے ہی اماں اور آگہ ساری عیدی قرض لے لیتی ہیں اور مانگو تو ایسے ڈانٹتی ہیں جیسے اپنا زر اصل نہیں سود در سود مانگ رہے ہیں۔ واقعی یہ انکم ٹیکس بڑی خطرناک چیز ہے۔ جبھی تو سارے بزرگ پریشان رہتے ہیں۔

"مگر موٹی قصائن تو بالکل ٹیکس نہیں دیتی حالانکہ وہ تو ملک کی اتنی زیادہ جگہ گھیرے رہتی ہے۔" ببلو کا فلسفہ چل نکلا۔

"اور ننھا دھوبی بھی ٹیکس نہیں دیتا۔ سارے احاطے میں کپڑے پھیلا دیتا ہے۔ پتنگ اڑاؤ صفا رسّی میں پھنس جائے گی کرکٹ کھیلو گیند سیدھی کلف کی بالٹی میں جا گرے گی۔ صوفی آگہ پلیز ننھا پر ٹیکس لگوائیے نا ڈاکٹر ماموں سے کہہ کر۔" ٹیٹو نے التجا کی۔

"اور صوفی آگہ امیر خاں پر بھی ٹیکس لگنا چاہیے۔ تمام برامدے میں دھنیا مرچیں سکھانے کو پھیلا دیتے ہیں۔" گگو نے رائے دی۔

"افوہ کیا تم لوگ کچر کچر بولے جا رہے ہو۔ بھئی جس کی سالانہ آمدنی تین ہزار سے کم ہو اُس پر ٹیکس نہیں لگتا۔ کیا تمھاری عیدی سال بھر میں تین ہزار ہو جاتی ہے۔" صوفی آپا نے پوچھا۔

"تین ہزار باپ رے باپ........ تین۳ روپئے بھی مشکل سے ہوتے ہیں۔ عشرت ممّا، فرحت ممّا ہوتے یہاں تو شاید تین۳ چالیس۴۰ ہو جایا کرتے۔ تینوں اپنی عیدی کو محفوظ پاکر مطمئن ہو گئے۔ بھلا کون اللہ کا بندہ اتنی عیدی دے گا۔ جو ٹیکس لگے اور وسیم بھائی کی طرح بوکھلانا پڑے۔

"بھئی ہم کبھی تین ہزار نہیں کمائیں گے"، ٹیٹو نے فیصلہ کیا۔

"وہ کیوں بھئی؟"

"ٹیکس جو دینا پڑے گا۔ بھیّا ہم تو بس دو ہزار سالانہ کمائیں گے۔ ہیں بیلو؟" ٹیٹو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگ دو ہزار سالانہ سے زیادہ کیوں کماتے ہیں۔ کم کمانے ہی میں فائدے ہیں۔

"اور اتنے روپیوں میں گزر کیسے ہو گی۔" صوفی آپا نے پوچھا۔

بچے بھوکے مر جائیں گے۔ بیوی جوتیاں مار کر گھر سے نکال دے گی۔"

"آہا جناب مزا آئے گا۔" بیلو چہکے "موٹی قصائینی کے قبضے

دیکھے ہیں پیسہ نہیں کماؤ گے تو مارتے مارتے گلاب جامن بنادے گی۔"
اُف یہ موٹی قصائینی! غریب ٹیٹو کی جان کو مصیبت ہو گئی تھی۔ روز کم بخت کو کھٹی ڈکاریں آتی تھیں۔ مجال ہے جو ہیضہ ہو جائے۔ ابھی پرسوں آ کر کم بخت چڑانے لگی۔

"اے دولھا میاں لال اوڑھنی اور سونے کے کنگن لوں گی۔"
اگر لوگوں نے روک نہ لیا ہوتا تو ٹیٹو وہیں اُسے قتل کر دیتے۔

"ٹیکس ہر ایک فرد کی آمدنی کے مطابق لیا جاتا ہے۔ جیسے جیسے آمدنی بڑھتی ہے ٹیکس بھی بڑھتا ہے۔ اُسے سُپر ٹیکس کہتے ہیں۔" صوفی آکہ بولیں۔

"صوفی آلہ! اشعر کے ابا کہہ رہے تھے اس دن کہ انکم ٹیکس والے کچھ نہیں چھوڑتے سب کچھ لے جاتے ہیں۔" بیکو بولے۔ "کل بیچارہ کہہ رہا تھا انکم ٹیکس والوں نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ بہت ستا رہے ہیں بیچارے ابا کو۔"

"اشعر کے ابا نے پانچ سال سے ٹیکس نہیں دیا ہے۔ آمدنی چھپاتے رہے اب پکڑے گئے تو سٹپٹا رہے ہیں۔"

"آمدنی کیسے چھپاتے رہے۔"

"جھوٹ موٹ فرضی ناموں سے تجارت کرتے تھے۔"

"کیوں؟" بیکو نے ناک سکوڑی۔

"تاکہ سُپر ٹیکس نہ دینا پڑے۔ اگر وہ اپنی ساری آمدنی اپنے

ہی نام سے دکھاتے تو زیادہ ٹیکس لگتا۔ کئی جھوٹ موٹ کے ناموں سے آمدنی دکھائی، تو ٹیکس تقسیم ہو کر کم ہو گیا۔"

"بے حد چالاک ہیں! اب کیا ہو گا؟"

"سارے روپے مع جرمانے کے بھرنا پڑیں گے۔"

"اُن کی کئی کوٹھیاں ہیں، باغات ہیں، ملوں میں شیر ہیں وہ بیچنا پڑیں گے۔"

"اگر کوٹھی بک گئی تو بُرا ہو گا۔" تینوں فکر مند ہو گئے۔ اشعر کی کوٹھی بے حد شاندار تھی۔ لمبا چوڑا میدان تھا۔ کرکٹ اور فٹ بال کے لئے فرسٹ کلاس جگہ تھی۔ ویسے نیبو نارنگیاں اور کچے پکے آم توڑنے میں بھی خاصہ مزہ آتا تھا۔

"مگر یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ نہ دیں ٹیکس تو؟" بیلو نے پوچھا۔

"تو صفا جیل میں جائیں گے۔" گگو ہمیشہ بھیانک قسم کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔

ابھی تینوں کوٹھی کے غم میں گھل رہے تھے۔ کہ صوفی آکہ کو کا آماں نے آواز دے دی۔

"اے بی صوفی ان احمقوں سے بیٹھی کہاں سر مار رہی ہو! ذرا ادھر آنا۔" اور صوفی آکہ بھاگ گئیں۔ ابھی کتنے سوال تینوں کے دماغ میں اُچھل کود مچا رہے تھے۔ آخر انکم ٹیکس والوں کو

یہ چھوٹ کیوں ملی ہوئی ہے۔ زبردستی ٹیکس لگا دیتے ہیں۔ کوئی کمائے انھیں مفت میں دے دے۔ پولیس بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بھلا یہ حد ہے کہ نہیں کتنے ہزار ٹیکس ہیں! انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس، تفریح ٹیکس، نہ کھاؤ نہ پیو نہ ہنسو کھیلو بس ٹیکس دیے جاؤ۔"

"بھئی ہم تو سیدھے جاکر نہرو چاچا سے شکایت کردیں۔ دو منٹ میں انکم ٹیکس والوں کو چیں بلا دیں گے۔" گگو نے فیصلہ کیا۔

"کیا بہت تگڑے ہیں؟"

"اور نہیں تو کیا آپ کی طرح پچپس ہیں۔"

"کچھ زیادہ تو تگڑے بھی نہیں۔ دُبلے سے ہیں۔" بیلو نے چڑھ کر کہا۔

"دُبلے سے کیا ہوتا ہے۔ طاقت تو ہے جناب!" گگو خود دُبلے ہیں مگر سب کو بھون بھون کر مزا لیتے ہیں۔ ان کی حرکتیں قطعی دُبلی پتلی نہیں ہوتیں۔

"مگر یہ تو صفا زیادتی ہے۔" تھوڑی دیر سوچ کر بیلو نے فیصلہ کیا۔

"اور کیا زیادتی تو ہے ہی۔" گگو ہمیشہ ٹیڑھو اور بیلو کی ہر بات پر فیصلہ کرتے ہیں جیسے وہ تو پہلے ہی یہ بتا چکے تھے۔

"بیچارے اشعر کے کتّے کا گھر بھی بک جائے گا۔" ٹیٹو غمگین ہو گئے۔

"اور نہیں تو کیا بس کتے کا گھر بچ جائے گا؟ کہ تو بھئی اس میں اپنے کتے صاحب کو رکھو۔" گوّتے حسبِ عادت چڑایا۔

"ہم اُسے اپنے گھر میں رکھ لیں گے۔"

"جی ہاں بہت رکھا اپنے گھر میں، خالہ امّاں گولی ماردیں گی۔" ٹیٹو نے ڈرایا۔

حالانکہ بیچاری خالہ امّاں کے پاس سروتے سے زیادہ خطرناک ہتھیار ہی نہ تھا۔ یاد ہے اُنکی بھینس نے ذرا اشعر کے ابّا کے پھول چرلئے تھے تو اُسے کانجی ہاؤس بھجوادیا تھا۔ جب سے خالہ امّاں اُدھار کھائے بیٹھی ہیں۔ اُن کا بس چلے تو اُنھیں مُرغا بنا کر موٹی قصائی کو پیٹھ پہ چڑھا دیں۔"

بیلو نے دل ہی دل میں اس حسین نظارے کا نقشہ کھینچ کر لطف اٹھایا۔

خالہ امّاں سے سب ہی ڈرتے تھے۔ خصوصاً وسیم بھائی کی تو وہ آتے جاتے ٹانگ کھینچتی تھیں۔ وسیم بھائی آتے جاتے بھی بہت تھے۔ ایک پل ان کی ٹانگوں کو قرار نہ تھا۔ گھڑی باہر تو گھڑی اندر، لمبے لمبے ڈگ بھرتے شڑاپ شڑاپ پاجامہ پھٹکارتے دن میں سینکڑوں چکّر لگا ڈالتے تھے۔

"مگر یار یہ کمّی آپا پر ٹیکس کیوں نہیں لگتا۔ کتنی عیدی اینٹھتی ہیں جب دیکھو قمیصیں بن رہی ہیں۔"

"خدا قسم ان کی قمیصوں پر ٹیکس لگ جائے تو مزا آجائے۔"

"اور زبیدہ آپا کی چپلوں پر بھی ٹیکس لگے۔ پلنگ کے نیچے قطار کی قطار لگی ہے۔ لال پیلی اودی ہری نیلی چاکلیٹی۔"

"ایں ہیں جناب چاکلیٹ کی کہاں ہے چپل؟" ٹینو نے سوچا چلو ایک بات پر تو گگو کی جہالت پکڑی گئی۔ مگر بجائے نادم ہونے کے گگو صاحب دونوں ٹانگیں ہوا میں لہرا کے ٹھٹھے لگانے لگے۔ ببکو نے فوراً ان کا ساتھ دیا۔

"چاکلیٹ کی نہیں بیوقوف، چاکلیٹی... چاکلیٹ کے رنگ کی۔"

"ارے ہم سمجھے چاکلیٹ کی۔" ٹینو منمنائے۔

"نرے گاودی ہو یار۔" گگو ہنسے۔

"کیوں یار گگو اگر سچ مچ چاکلیٹ کی چپلیں بنا کریں تو۔" ببکو نے خواب آلود نظروں سے فضا میں چاکلیٹ کی چپلیں بنا ڈالیں۔

"ہاں.... اور موتی چور کے لڈوؤں کی بھی چپلیں بنا کریں۔ مزا آجاتا۔" گگو نے چٹخارا لیا۔

"اور سموسوں کی؟"

"جناب قلاقند کی بھی۔"

"بالوشاہی کی بھی تو۔"

"مگر ببمبئی کے حلوے کی چپلیں لاجواب ہوں گی۔"

"جناب رس گلوں کی چپلیں بہترین رہیں گی۔"

اور تینوں قسم قسم کی مٹھائیوں اور لذیذ کھانوں کی چپلیں بنابناکر ان کے خیالی مزے سے جھوم جھوم کر چٹخارے لینے لگے۔ تینوں کو کھانوں کے ذکرے بے اختیار بھوک لگ آئی۔ مگر بھلا بے وقت کون کھانے دے گا۔ نہ جانے کس احمق نے دنیا میں اتنی بیہودہ بیہودہ چیزیں رائج کر دیں۔ چڑیاں دن بھر دانا چگتی ہیں کوئی منع نہیں کرتا۔ بکریاں جب چاہیں مزے سے بول چاب لیں۔ مگر انسان وقت سے کھائے، وقت سے سوئے، وقت سے جاگے اور پھر اوپر سے انکم ٹیکس دے۔

اُف حد ہے زیادتی کی!۔

صوفی آلہ بھی حد ہیں۔ پوری بات بتا کر بھی نہیں گئیں۔ آخر یہ انکم ٹیکس کس نے لگانا شروع کیا، کب اور کیوں کیا؟ ابھی صرف ساڑھے گیارہ ہی بجے تھے پورا ایک گھنٹا تھا کھانے میں۔ آموں سے تو بھوک اور بڑھ گئی۔

اتنے میں منن بھیّا کچھ کاغذ میں سے نکال کر کھاتے ہوئے گزرے تینوں چوکنّے ہو کر انھیں گھورنے لگے۔

"کیا کھا رہے ہو منن بھیّا؟" بیلو نے تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے اُن کے جبڑوں کو سفر کرتے دیکھ کر پوچھا۔ منن بھیّا نے ذرا کے ذرا رفتار کم کی، ایک موڑ لیا، گیر بدل کر جبڑوں کا کلچ چھوڑ دیا اور چال دو گنی کر دی۔

"چمڑا!" منن بھیّا نے کاغذ میں لپٹا ہوا چمڑے کا بھورا بھورا چمکدار ٹکڑا نکالا۔ "کھاؤ گے؟"

"آخ تھو۔ ہم تو نہیں کھاتے۔" ٹیٹو بگڑے۔

"مت کھاؤ۔" یہ کہہ کر منّ بھیّا نے کھٹ سے چمڑے کا ٹکڑا منہ میں ڈال کر چکی چلادی۔ تینوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آج ہر انسان حد کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

"کھا کے تو دیکھو گدھے۔" منّ بھیّا نے تینوں کو ایک ایک ٹکڑا دیا۔ ارے واہ! تینوں "بھوچکے" رہ گئے۔

"اور دو منّ بھیّا۔" ٹینٹو "کھٹّے میٹھے" چمڑے کا چٹخارا لے کر گھگیائے۔

"ختم ہوگیا بھئی۔" منّ بھیّا نے پتلون کی جیبیں لوٹ دیں۔

"کہاں سے آیا تھا؟"

"ہمارے جوتے میں سے نکلا تھا اور کہاں سے آتا۔"

"سچ؟"

"اور نہیں تو کیا جھوٹ۔"

"کیا سب جوتوں کا چمڑا میٹھا ہوتا ہے؟" بیلو نے اپنی نئی چپّل کو دیکھ کر چٹخارا لیا۔

"نہیں بس کسی کسی میں ہوتا ہے۔ اصل میں دودھ دینے والی بکری کا چمڑا بہت میٹھا ہوتا ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ؟"

"اور کیا، یہ تو بھیڑ کا چمڑا ہے اس لئے تھوڑا کھٹّا ہے۔ بکری کا بہت عمدہ ہوتا ہے۔" منّ بھیّا بڑی سنجیدگی سے

بولے۔

"مگر پتا کیسے چلے کہ کون سا چمڑا میٹھا ہے؟"

"جوتے سونگھو صاف پتا چل جائے گا۔" چنانچہ تینوں مختلف قسم کے جوتے چپلیں اور سینڈلیں نہایت تندہی سے سونگھنے لگے۔

سارے گھر کے نئے پرانے جوتے سونگھ ڈالے۔ مگر کسی میں سے بھی منّن بھیّا کے جوتے کے چمڑے جیسی مہک نہ آئی۔ صرف وسیم بھائی کے جوتے سے لہسن پیاز کی تھوڑی تھوڑی بدبو آرہی تھی۔ کیوں کہ وہ باورچی خانے کے کوئی ڈیڑھ سو پھیرے لگا چکے تھے۔

روز تینوں منّن بھیّا سے میٹھے چمڑے کی تلاش کے پروگرام پر بحث مباحثہ کرتے۔ جوتے سونگھنے والی اسکیم بے طرح فیل ہوگئی۔ کیونکہ جوتے سونگھتے دیکھ کر آپا بہت خفا ہوئیں۔

"ہائے اللہ آپا نہ جانے کمبختوں کو کیا ہوگیا ہے۔ ہر وقت جوتے سونگھتے ہیں۔ اور پوچھو کہ بھئی کیوں تو جواب ملتا ہے۔ بھئی ہمیں اچھی لگتی ہے خوشبو۔" اس پر آپا اتنی چلّائیں کہ ان کا گلا بیٹھ گیا۔ اور انھوں نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر کوئی جوتے کو ہاتھ لگاتا بھی پکڑا گیا تو اُسی جوتے سے اس کی ٹانٹ گنجی کر دی جائے گی۔ مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ منّن بھیّا

کے دل میں ہی رحم آگیا۔ اور ایک دن انھوں نے تینوں کے کان میں چپکے چپکے اطلاع دی کہ اگر چمڑا کھانا ہو تو تیار ہو جاؤ۔ تینوں لپک کر دوڑے۔

"بتایئے من بھیّا۔ کہاں ہے؟"

"وہ دیکھو۔ جو کمّی آپا کی نئی جوتی ہے نا۔"

"وہ راک اینڈ رول والی؟"

"ہاں ہاں۔"

"وہ جو بالکل نئی ہے اور وہ بمبئی سے لائی تھیں۔"

"اُنہہ۔ ہاں بھئی وہی۔ اس میں اندر کی تہہ کا جو چمڑا ہے انتہا سے زیادہ میٹھا ہے۔" من بھیّا نے چٹاخ سے تالو سے زبان ٹکرائی۔

"کمّی آپا دیں گی تھوڑی۔" ٹینوڑ نے حسرت سے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کبھی جو دے جائیں پکّی کنجوس ہیں۔"

"ایسا کرو بلیڈ سے اوپر کا چمڑا ہوشیاری سے کاٹو۔ اندر کا میٹھا چمڑا نکال کر کاغذ بھر کے صفائی سے سی دو۔ پتا بھی نہیں چلے گا۔" من بھیّا نے ترکیب بتائی۔

من بھیّا تو ٹہل گئے۔ تینوں حسرت سے کمّی آپا کی نئی گرگابی دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے لگے۔ واقعی گرگابی نہایت رسیلی اور لذیذ دکھائی پڑ رہی تھیں۔ تینوں کے جبڑے

دُکھنے لگے اور پانی بھر آیا۔ کتنی ہوشیار ہیں۔ کیا مجال جو اُتار جائیں ذرا بھی۔ تینوں اِردگِرد ایسے منڈلانے لگے جیسے لڈّوؤں کے تھال کے گرد مکھیاں۔

"کیوں بھئی موقع ملا۔" منّن بھیّا پانی پینے کے بہانے سے تینوں کے پاس سے گزرے۔

"وہ اُتارتی تو ہیں نہیں گرگابی۔" ٹینٹو روہانسے ہوگئے۔

"اچھا ہم ایک ترکیب کرتے ہیں تم ہوشیار رہنا۔"

منّن بھیّا سے اسی دن کمّی آپا کی اَن بَن ہوگئی تھی۔ کمّی آپا نے منّن بھیّا کی سب سے لاڈلی قمیص کی جیب پھاڑ ڈالی۔ غصّے میں اگر منّن بھیّا نے ان کی چوٹی میں سے لمبی سی لٹ کاٹ ڈالی۔ بس غضب ہی تو ہوگیا۔ کمّی آپا باوں کی کٹی ہوئی لٹ کو پیارے بچے کی لاش کی طرح گود میں رکھے گھنٹوں بھوں بھوں روتی رہیں۔ بس دونوں کی بول چال بند۔

"بھئی کوئی کیرم کھیلتا ہے۔" انھوں نے جیسے دیوار کو دعوت دی۔ کمّی آپا نے نہایت بے رُخی سے سوں سے ناک بجائی اور کٹی ہوئی لٹ ٹٹولنے لگیں۔

صوفی آلہ اور زبیدہ آپا تو آگئیں۔ اب ایک کھلاڑی کی کسر تھی۔ بڑی مشکل سے انھوں نے کمّی آپا کو پھسلایا۔

"بھئی کمّی تم ہمارے ساتھ ہو جاؤ۔ منّن پاجی کی طرف

دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔"

کمّی آپا نے گرگابی اُتاری۔ تینوں چٹوروں کے دل کی کلیاں کھِل گئیں۔ مگر کچھ سوچ کر انھوں نے واپس پہن لی۔ بیچاروں کے منہ اُتر گئے۔

"کس قدر کی بدذات ہیں! کمّی آپا۔"

مگر تھوڑی دیر بعد اُن کی دُعاؤں میں اثر ہونے لگا۔ کمّی آپا یوں آڑی بیٹھی تھیں تو ٹھیک سے نہیں کھیل پا رہی تھیں۔ صوفی آکے ہارنے جو لگیں تو چڑھ گئیں۔

"اُنہہ کمّی یہ کیا بکری کی طرح بیٹھی ہو۔ سیدھی طرح بیٹھ کر کھیلو نہیں تو غارت ہو جاؤ۔"

کمّی آپا نے اپنی عزیز از جان گرگابی اتاری اور پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔ منّ بھیّا نے آنکھ ماری۔ لال لال رسیلی گرگابی دیکھ کر تینوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ٹہلتے ٹہلتے تینوں شکاری پہنچے۔ پہلے ہی حملے میں غڑاپ سے گرگابی ٹیٹو صاحب کے نیکر میں۔

نیبو کے جھاڑ کی آڑ میں تینوں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے بلیڈ سے جوتی کا چمڑا کاٹا۔ پہلے ہی ٹکڑے پر چھین جھپٹ شروع ہو گئی اور فساد ہوتے ہوتے بچا۔ خیر تینوں نے ایک ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر دانت مارے۔ لاحول ولا قوۃ! ہائے

بدبو کے دماغ سڑ گیا۔

مگر اس سے قبل کہ وہ چمڑا تھوک پاتے کنّی آپا نے بھوکی بلّی کی طرح اُن پر حملہ کر دیا۔ اپنی دُلاری پیاری گرگابی کی پوسٹ مارٹم کی ہوئی لاش دیکھ کر وہ سیڑھیوں پر پچھاڑ کھا گئیں۔ دھپ جو لگا تو ٹیٹو تو ایک جھٹکے سے چمڑے کا ٹکڑا انگل ہی گئے۔ کھانستے اور کتے تینوں بی امّاں کے دربار میں گھسیٹ کر لائے گئے۔

"اے کلموہو! نگوڑی کی نئی جوتی کا قیمہ کر ڈالا۔ یہ کیا کر رہے تھے؟"

"کھا رہے تھے۔" ٹیٹو ٹھنخنائے!

"اوئی! جوتی کھا رہے تھے۔ لے لو اور سنو! اے تم پہ خدا کی سنوار، جوتیاں بھی کھانے لگے؟" بی امّاں غم اور غصّے سے نڈھال ہو کر سینے میں سے ڈلی نکال کر پھانکنے لگیں۔

"سوّرو! یہ چمڑا کیوں کھا رہے تھے؟" آکر نے ایک ایک دھول تقسیم کر کے پوچھا۔

"میٹھا ہوتا ہے... منّ بھیّا سے پوچھ لیجیے، انھوں نے کہا تھا۔" صفائی پیش کی گئی۔

"چمڑا؟...... میٹھا؟......" منّ بھیّا بھولی سی صورت بنا کر بولے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اصل معاملہ کیا تھا۔ گھنٹوں تینوں سے جرح کر کے پلیتھن نکال دیا۔

"رومت کمی۔ میرے پاس ان تینوں کی عیدی کے پیسے رکھے ہیں تم اس میں سے نئی گرگابی بمبئی سے منگوا لینا"۔ بی امّاں نے ڈھارس بندھائی۔ یہ لیجئے عیدی بھی ختم!

کچھ عیدی کا غم کچھ سارے گھر کی پھٹکار، زندگی سے عاجز آکر تینوں نہایت بجھے ہوئے خاموش تاج اکبر کی سیڑھیوں پر منہ لٹکا کر بیٹھ گئے۔ منّن بھیّا بڑے فکر مند سے آئے۔ بڑے دُکھی ہوکر کہنے لگے۔

"یار اب میں کیا کرسکتا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ میں نے بھی اندازاً کہہ دیا تھا۔ میں نے سونگھی نہیں تھی گرگابی"۔

"تو کیا سونگھنی چاہئے تھی۔" گگّو بولے

"اور کیا بھئی نہیں تو ویسے ہی کاٹ ڈالنی چاہئے۔ ہیں؟ ارے کیا تم لوگوں نے واقعی بغیر سونگھے کاٹ ڈالی گرگابی؟"

"ہاں!" تینوں نہایت نادم ہوکر بولے۔

"نرے گاودی ہو۔ یہ پکوڑا سی ناک اللہ میاں نے کاہے کو دی ہے۔ انھوں نے ٹیٹو کی پھولی ہوئی ناک دبا کر کہا۔ اور خوب ڈانٹا "گدھے کہیں کے! پہلے ہر جوتے کو نہایت احتیاط سے سونگھنا چاہیے"۔

اس کے بعد تینوں جب کسی کو نیا جوتا پہنے دیکھتے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوتے اور بڑی ہوشیاری سے

جوتا سونگھ لیتے۔ مگر ہر جوتے میں سڑاند آتی کسی میں سے اُس لذیذ چمڑے کی میٹھی میٹھی مہک نہ آتی جیسا منّن بھیّا نے دیا تھا۔

اس بات کو بہت عرصہ ہوا۔ ابھی کلّو بُوا کچھ دن ہوئے دلّی سے آئیں تو پٹاری میں کھٹئی رنگ کا چمڑا نکال کر تینوں کو بانٹا۔ ڈرتے ڈرتے تینوں نے چکھا۔

"ارے کلّو بُوا یہ چمڑا کہاں ملتا ہے؟"

"اے میں صدقے جاؤں میاں یہ چمڑا تھوڑی ہے۔ یہ تو آم کا پاپڑ ہے۔"

"آم کا پاپڑ!"

"ہاں میاں آم کا رس نکال کر تھالوں میں سُکھا لیوے ہیں۔"

تینوں نے خونی نظروں سے منّن بھیّا کی طرف دیکھا جو نہایت معصوم صورت بنائے آم کا پاپڑ چوس چوس کر چٹخارے بھر رہے تھے۔

"حد ہوگئی یار۔" گگّو نے کہا۔

"یعنی قطعی حد ہوگئی!" ببّو نے اُن کی تائید کی۔

اللہ کرے منّن بھیّا کی شادی شمیم سے کردیں امّاں اور وہ اور بھی موٹی ہوجائے۔ ان کا مار مار کے بھرکس نکال دے۔" ٹیٹو نے کوسا اور تینوں کے منہ میں آم کا پاپڑ چمڑے سے بھی زیادہ بدمزہ ہوگیا۔

ٹیٹو کی جان کو ایک غم کھائے جاتا تھا۔ نہ جانے اللہ میاں نے کیا سوچ کر اُن کی ناک چو کھونٹی تعمیر فرمادی۔ ویسے وہ کافی حسین ہیں۔ مگر ناک نے اُن کی لُٹیا ڈبودی ورنہ وہ ان کا پیغام شہزادی این یعنی ملکۂ انگلستان کی بیٹی سے روانہ کروا دیتے۔

کاش کوئی پری وری مل جاتی۔ اور اپنی جادو کی چھڑی لاکر اُن کی چٹیل ناک سے چھوا دیتی۔ اور زن سے اُن کی ناک پتلی اور ستواں بن جاتی۔ سنڈریلا کی خاطر پری نے کدو کی فٹن بنا دی تھی۔ اور چوہوں کو گھوڑوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ کیا کوئی کمبخت پری ان کی ناک کو جو کدو سے قطعی ڈیل ڈول میں کم نہ تھی جادو کے زور سے کھڑا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ پریاں وریاں نہ جانے آج کل کہاں اونگھ کر بیٹھ رہی ہیں۔ اُن کی ناک نہ جانے کیوں روٹھ کر یوں منہ پھلائے ان کے چہرے پر پھسل پڑی ہے۔ بس چلتا تو کمبخت کو چابک مار مار کر کھڑا

کر دیتے۔

ایک دن وہ اُداس بیٹھے اپنی ناک ٹٹول رہے تھے۔ پروین نے انھیں 'چپٹل' کہہ دیا تھا چونکہ انھوں نے اُس کی گڑیا کو چٹیا سے لٹکا کر اُسے چکر دے دئے تھے۔

"کیا بات ہے ٹینّو یار۔ ناک کیوں ٹٹول رہے ہو۔ کیا بیلّو نے گھونسا مار دیا؟"

"ارے واہ بڑے آئے، بیلّو صاحب مارنے والے،" ٹینّو بگڑے۔

"کچھ زیادہ پھولی ہوئی لگ رہی ہے۔"

ٹینّو ایک دم غمگین ہوگئے۔ کچھ دن سے انھیں شبہہ ہو رہا تھا کہ وہ کم بڑھ رہے ہیں مگر اُن کی ناک کھیرے ککڑی کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔

"اماں ایک ترکیب کیوں نہیں کرتے۔ فرسٹ کلاس ہوسکتی ہے ناک۔"

"ایں ہیں کچھ جو فرسٹ کلاس ہو جائے۔"

"اُنہہ مت مانو..... ہمارا کیا ہے تمھاری ہی ناک چپٹی رہ جائے گی۔ لاپروائی سے منن بھیا بولے اور گھٹنا ہلانے لگے۔ بیلّو کو اُن کی تجویزوں پر عمل کرکے بڑے تلخ تجربے ہوچکے تھے مگر ناک کا معاملہ تھا۔ ترکیب سُننے میں کیا نقصان ہے۔

"کیسے؟" انھوں نے بظاہر بے توجہی سے پوچھا۔

"وہ جو کپڑے ٹانگنے کی چٹخنی ہوتی ہے نا؟"

"ہاہاں!"

"بس وہ لو اور رات کو سوتے وقت ناک اُس سے دبا کر سو جاؤ صبح تلوار کی طرح پتلی نہ ہو جائے تو میرا ذمّہ۔"

"ایں ہیں...... کہیں ہوئی نہ ہو۔" ٹیٹو کو یقین نہ آیا مگر امید کی ایک ہلکی سی لہر اُن کا دل دھڑکا گئی۔

"اُنہہ گدھے، ہم کوئی مذاق کر رہے ہیں...... یہ مجیب بھائی کی ناک ہے نا۔"

"ہاں بہت کٹارا سی ہے۔"

"تمھاری طرح پھلکی جیسی تھی پہلے۔"

"اچھا— تو پھر—"

"پھر کیا... تمھارا سر— چغد ہو تم۔ بس چٹخنی لگا کر سوا جیسی بنالی ناک۔ ویسے بھئی تم جانو اور تمھاری ناک۔"

منّ بھائی تو شگوفہ چھوڑ کر چل دیے۔ ٹیٹو سوچ میں پڑ گیا۔ آزمانے میں ایسا کون سا ٹوٹا آجانے کا خدشہ ہے۔ موقع مناسب دیکھ کر انھوں نے رسّی میں اٹکا ہوا کلپ اُتار کر نیکر کی جیب میں ٹھکا لیا۔ رات کو جب بتّیاں بجھ گئیں تو چپکے سے لگایا۔ پہلے تو ایسا معلوم ہوا کسی نے دانتوں میں لے کر ناک چبا ڈالی۔

آنکھوں میں آنسو اُبل آئے۔ مگر ملکۂ انگلستان کے اکلوتے داماد بن کر بکنگھم پیلس میں راج کرنے کا خیال دل کو ڈھارس دلاتا رہا۔ نیند تو آگئی۔ مگر رات بھر ڈراؤنے خواب ستاتے رہے۔ کبھی دیکھتے ناک میں ایک اژدہا لٹکا ہوا ہے کسی صورت نہیں چھوڑتا۔ کبھی دیکھتے اُن کی ناک کھنچ کر ہاتھی کی سونڈ بن گئی اور ایک شیر اُس میں جھول رہا ہے۔ رات کو کراہ کراہ کر کئی بار جاگے پھر دل پر پتھر کی چٹان رکھ کر سو گئے۔ پھر خواب میں دیکھا ناک اتنی بڑھی اتنی بڑھی کہ نیم کے پیڑ کے برابر ہو گئی۔ اس پر بندر اُتر رہے ہیں چڑھ رہے ہیں۔ میناؤں نے گھونسلے بنا لئے ہیں۔ ایک ہُد ہُد اپنی نکیلی چونچ سے سوراخ پہ سوراخ کئے جا رہا ہے۔ بہتیرا ہش ہش کر رہے ہیں پنجے گاڑے بیٹھا ہے۔ ناک ہے کہ ہوا کے جھونکوں میں ایسی جھوم رہی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک جھکڑ اور آیا تو چرچرا کر ٹوٹ پڑے گی۔ ناک اتنی لمبی ہو چکی تھی کہ اس کی پھنگی تک ان کی ہش ہش نہ پہنچ سکی۔

صبح جونہی اماں فجر کی نماز کو اُٹھیں تو صبح کی دھندلی روشنی میں ٹیٹو کی ناک پر ایک بڑا سا کوڑا بیٹھا دکھائی دیا۔ پنکھے کی ڈنڈی جو انھوں نے تاک کر کوڑے کی ٹانگوں پر ماری تو ٹیٹو بلبلا کر چنگھاڑے۔ اب جو انھوں نے دیکھا تو

کوڑا نہیں چیخنی تھی ۔ بوکھلا کر چلاّئیں۔

"لے بی اختر ذرا دیکھنا... ٹیٹو کو کیا ہو گیا ۔ ہے ہے"

چاروں طرف جگار ہو گئی سب ٹیٹو کے گرد جمع ہو گئے۔ اب ناک پر جہاں کلپ لگا تھا وہاں دورانِ خون بند ہو کر گہرا سا گڈھا پڑ گیا تھا۔ جتنی ناک باہر رہ گئی تھی وہ آلو بخارے کی طرح ہو کر سوج گئی تھی۔ بڑی مشکل سے کلپ نکالا گیا۔ ٹھنڈے گرم پانی سے ٹکور دی گئی تب کہیں جا کے ناک کا دورانِ خون ٹھیک ہوا، ذرا سوجن اُتری۔ تیل کی مالش کی گئی۔

وہ دن اور آج کا دن ٹیٹو میاں نے ملکہ الزبتھ کی دامادی کی ساری امیدیں بالائے طاق رکھ دیں۔ اگر وہ منّن بھیّا کی بتائی ہوئی حسن بڑھانے کی ترکیب پر کچھ گھنٹے اور عمل کر لیتے تو آج قطعی ناک سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

Scanned by CamScanner

بیلو کو ہمیشہ سے گپیں مارنے کا شوق ہے۔ ایسی ایسی ٹھوکتا ہے کہ بس کیا بتائیے۔ بیٹھے مزے سے کیرم کھیل رہے ہیں یا زنازن ترپ چال ہو رہی ہے۔ یا کوئی نہایت دل چسپ کہانی پڑھ رہے ہیں۔ عین اُس وقت جب کہ ہیرو اژدہے کے چنگل میں پھنسا زور مار رہا ہے۔ بیلو صاحب آن دھمکے۔

"چلو.... اماں بلاتی ہیں۔" اب نہ جائیں تو کیا عجب۔ جو بُلا ہی رہی ہوں۔ اماّئیں عموماً ایسے ان گڑھ موقعوں پر ضرور بلانے کی عادی ہوتی ہیں۔ خیر اماں کے پاس گئے۔

"اماں آپ نے ہمیں بلایا تھا؟"

"لے دور ہو کلمو ہو میں کاہے کو بلاتی۔ کون تمہاری صورت کو ترس رہی ہوں کہ چڑھے چلے آتے ہو چھاتی پر۔" اماں چڑھ کر جواب دیتیں۔ اب آپ ہیں کھسیانے، اور بیلو صاحب دانت نکوسے ہنس رہے ہیں۔ جی چاہتا ایک مکاّ ایسا جڑیں کہ

سارے دانت ٹوٹ کر حلق میں جا پڑیں۔ مگر دانت تو ویسے ہی ٹوٹ کر اوگے ہونگے ڈراؤنے نکل رہے ہیں۔ ذرا بیلو کو دیکھا اور چلائے۔

"کا آآں.... دیکھو ہمیں مارا۔"

اور آماں بنا پوچھے مجھے ڈانٹنے لگیں گی۔

"ٹھہر تو جا سور، خبردار جو تونے میرے بیلو کو ہاتھ بھی لگایا۔ کھال اُدھیڑ کے رکھ دوں گی۔" اب انھیں لاکھ سمجھائیے کہ یہ آپ کا لڈو کی شکل کا لال دل کا بہت کالا ہے۔ مگر کون سُنتا ہے!

اور یہ تو روزانہ کا اُصول بنا لیا ہے۔ جہاں آبا کے پیٹ پر بیٹھے اور شکایتوں کا دفتر کُھل گیا۔

فلاں نے منہ چڑایا تھا۔ گُگّو نے گھونسا دکھایا تھا۔ عذرا پروین نے گلاب کا پھول توڑا تھا۔ ٹیٹو نے مُرغی کی دُم کھینچی تھی۔

اب کہو بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ عذرا پروین کی گڑیا کا بیاہ تھا۔ ایک دو پھول توڑ لئے تو کون سا اندھیر ہو گیا۔ یا بیچارا ٹیٹو بیٹھا بور ہو رہا تھا ایک ذرا کے ذرا مرغی کی دُم کھینچ لی تو کون سے اس کے لال جھڑ گئے۔

مگر ایک دن بیلو پکڑے گئے۔

"آئیس لینڈ میں برف ہی برف ہوتی ہے۔ لوگ برف کے گھروں میں رہتے ہیں۔ وہاں برف کی سڑکیں، برف کے سینما گھر، برف کے اسکول ہوتے ہیں۔ لوگ برف کے ڈیسکوں پر بیٹھ کر برف کی کتابیں پڑھتے ہیں اور ماسٹر صاحب برف کا کوٹ پہنے برف کے بلیک بورڈ پر برف کی چاک سے لکھتے ہیں۔ پھر برف کا چپراسی برف کے گھنٹے کو آئس کریم کی موگری سے ٹن ٹن بجاتا ہے۔ برف کے کتے سڑک پر بھونکتے ہوئے بھاگتے ہیں اور بچے برف کے فراک اور پینٹ پہنے برف کی فٹ بال سے کھیلتے ہیں۔ وہاں سب برف کے پیڑ ہوتے ہیں جن میں آئس کریم کی نارنگیاں، کیلے، ناشپاتیاں، امرود، انناس اور آم ہوتے ہیں۔ وہاں بھیڑیں اور بکریاں چوکولیٹ کی آئس کریم کی ہوتی ہیں۔ اور برف کی لال لال آگ پر برف کی روٹیاں پکتی ہیں۔

"ہے بیوقوف۔ برف کی آگ کیسے جل سکتی ہے؟" گگو سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا۔

"جلتی ہے.... ہمیں معلوم ہے۔"

"نہیں بیٹے برف کی آگ نہیں جلتی۔" ابا نے نہایت عالمانہ انداز میں عینک کے اوپر سے جھانک کر سمجھایا۔

"نہیں ابا..... جلتی ہے۔" بیلو نے بگڑ کر کہا۔ "لال نہیں سفید سفید آگ جلتی ہے۔ اور برف کے ریڈیو میں سے ادیوں

کے گیت نکلتے ہیں۔" بیلو کی آنکھیں چمکیں۔
ابا نے اخبار رکھ دیا۔ غور سے پہلے عینک کے نیچے سے پھر اوپر سے جھانک کر بیلو کو گھورا۔
"تم نہایت بے وقوف ہو۔ نرے چغد....." ابا نے ڈانٹ ڈانٹ کر ثابت کر دیا کہ بیلو گپ ٹھوک رہا ہے۔ وہاں برف کے بنے ہوئے جانور نہیں ہوتے۔
"مگر ابا کتاب میں لکھا ہے۔ برف کے کتے!"
"یعنی وہ کتے جو برف پر گاڑیاں گھسیٹتے ہیں۔"
"اور جناب بالکل آئیس کریم کے بیل نہیں ہوتے۔" ٹیٹو بولے۔
"ہوتے ہیں۔" بیلو ڈٹ گئے۔ ابا قطعی بور ہیں۔ لے کے بیلو کی پوری برف کی دنیا پگھلا دی۔
بیلو کا بہت مذاق اڑا اور ایک دم سے ان کی گپ بازی کی دھوم مچ گئی۔ اور جب گھر کے بزرگوں کے دل میں ایک بات بیٹھ جائے تو وہ سچی مان ہی لی جاتی ہے۔ اب تو یہ حال ہو گیا کہ بیلو اگر کہتے۔
"ہاں ہمیں بھوک لگی ہے۔" تو کوئی نہ یقین کرتا۔
"چل جھوٹے بدہضمی کرے گا۔ سہ پہر کو منوں ستو بھکسے تھے۔" حالانکہ غریب بیلو سہ پہر کو نیم کے نیچے بیٹھا چپکے سے چیونٹے

حلال کر رہا تھا۔ ستو کب گھلے کب پی لئے گئے اُسے خبر بھی نہ ہوئی۔ جب چیونٹے انتقاماً اُس کے نیکر میں گھس گئے اور اُسے بھنبوڑ کر رکھ دیا تو بیچارا کا آماں سے کولھوں پر چونا لگواتے لگواتے سوگیا تھا۔ گوکو اگر یاد بھی ہوتی تو وہ بیکو کی موافقت کی بات صاف پی جاتے۔

غرض بیکو کی دروغ گوئی کی دھاک ایسی بیٹھی کہ اُن کے سارے کارناموں پر پانی پھر گیا۔ ایک دن جب بیکو اپنے کمرے میں سونے کے لئے گئے تو وہاں سے سرپٹ رپٹے ہوئے آئے۔ اور دادی اماں کی گود میں چڑھ گئے۔

"لے بیکو سوتے کیوں نہیں۔ جاؤ اپنے کمرے میں" دادی آماں بولیں۔

"نہیں ——"

"کیوں؟"

"شیر!"

"شیر؟..... لے کیسا شیر؟"

"شیر.... اِتنا بڑا...." جتنے ہاتھ پھیل سکے پھیلا کر بیکو نے ناپ بتائی۔

"کہاں ہے شیر؟" آبا جان نے غصہ کرکے پوچھا۔

"ہمارے پلنگ کے نیچے۔"

"پھر تم جھوٹ بولے" ابا نے بڑی بڑی آنکھیں نکالیں۔
"سچ.... اللہ قسم!"
"جھوٹا...... لپاٹی" دادی اماں نے ایک زور کا دھپ جمایا اور اپنی گود سے سڑے ہوئے بینگن کی طرح لڑھکا دیا۔
"چل سیدھی طرح جا کے سو اپنے کمرے میں.... چل سور.... چل.... چل" آکر نے للکارا۔
"نہیں...... اماں.... شیر!"
"چو... و... وپ! شیر کا بچہ......" ابا ڈنکارے" جاتا ہے۔ اب لگاؤں سنٹیاں۔ شیر تو شیر اگر اژدہا بھی ہوتا تو ابا کی ڈانٹ سن کر بیلو ہنستے کھیلتے اس کے منہ میں چلے جاتے۔
"پھسڈی کہیں کا۔" چاروں طرف وہ لے دے ہوئی کہ بیلو رپٹے کمرے کی طرف....... شیر سے زیادہ خوفناک وہ چپتیں تھیں جو اُن کے سر کے گرد منڈلانے لگیں اور جو شیر اور چیتے سے کم خوفناک نہیں ہوتیں۔ شیر چیتے زندہ نگل جاتے ہیں۔ کان تو اتنی زور سے نہیں اینٹھتے۔
"ہر وقت جھوٹ بولتا ہے۔" اماں بولیں۔
"کس قدر گپیں تراشتا ہے نالائق۔" ابا نے رائے دی۔
"ڈرپوک بنا دیا ہے اماں باوا نے لاڈ کر کے۔ دو کوڑی کا نہیں رہا بچہ۔" دادی اماں نے طعنہ مارا۔ بڑی دیر تک

بیلو کے جھوٹ پر تبصرہ ہوتا رہا۔ پھر لوگ اِدھر اُدھر کی باتوں میں بیلو اور شیرو دونوں کو بھول گئے۔ لوگ سونے کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ میوہ رام بوکھلائے ہوئے آئے۔

"مجیب میاں باہر درد غہ جی کھڑے ہیں۔"

"درد غہ جی۔ اے ہے یہ کمبخت اس وقت کہاں آن ٹپکا۔" دادی امّاں بڑ بڑائیں۔ "لوگ پیچھا ہی نہیں چھوڑتے جان کو لگ گئے ہیں۔"

"ارے بُلاؤ بلاؤ...... آیئے انسپکٹر صاحب...... آیئے...... کیسے تکلیف فرمائی۔" ابّا نے چبوترے پر سے پکارا۔ انسپکٹر صاحب کے ساتھ ایک گچھے دار موچھوں والے صاحب بھی تھے۔ جو میوہ رام سے بھی زیادہ سٹپٹائے ہوئے تھے۔ دو چار لاٹھی بند کانسٹبل بھی تھے۔ ابّا گھبرائے کیا گڑبڑ ہوگئی۔ کالج کے لڑکوں نے کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"کیا کوئی چوری ووری ہوگئی...... خیریت تو ہے۔" ابّا نے پوچھا۔

"نہیں صاحب چوریاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ویسے سب خیریت ہے۔ یہ سرکس کے منیجر صاحب ہیں۔" انھوں نے گچھے دار موچھوں کی طرف اشارہ کیا۔

"آداب عرض آپ سے مل کر بڑی مسرّت ہوئی۔" ابّا

جھوٹ بولے۔

"صاحب.... وہ بات یہ ہے کہ سرکس کا ایک نہایت ہی بدمعاش شیر چھوٹ گیا ہے...."

"شیر؟ ـــــ شیر..... یعنی کہ شیر" ـــــ ابّا ہکلائے۔

"جی ہاں قطعی شیر..... نہایت خونخوار اور پاجی ہے۔ کل ٹرینر کو بھنبوڑ ڈالا ہوتا۔ بال بال بچے۔ ابھی آپ کے پڑوس سے رئیس صاحب نے فون کیا کہ ایک عدد شیر آپ کے باغ میں گھومتا دیکھا گیا ہے۔

"باباغ...... شیر ـــــ بیلو" ابّا مونڈھے پر ڈھلک گئے۔

"بیلو سچ ہی کہہ رہا تھا" انھوں نے سہم کر بیلو کے کمرے کی طرف دیکھا جس کا ایک دروازہ باغ کی طرف کھلتا تھا۔

"ہائے..... لوگو میرا بیلو ـــــ" امّاں جو کمرے سے سب کچھ سُن رہی تھیں پچھاڑ کھا کر ڈنلپ کے نئے گدّے پر گریں۔ پھر اُٹھ کر وہ دوڑیں بیلو کے کمرے کی طرف اگر ابّا نے کولیا بھر کر اُنھیں پکڑ نہ لیا ہوتا تو وہ سیدھی شیر کے جبڑوں میں گھُس جاتیں۔

"ہائے میرا بچہ ... ارے مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا تم لوگوں پر بھاری ہے بچہ...... ارے اُس کی جان لے کر ہی چین آیا۔" حسبِ دستور دادی امّاں نے گھبرائے ہوئے امّاں اور ابّا کی ٹانگ لی۔ "اب تو کلیجے میں ٹھنڈک پڑی۔"

"ہائے میرا ننھا منّا سا بیلو۔ شیر نے چبا ڈالا اور اس نے منہ سے ڈر کے مارے آواز بھی تو نہیں نکالی۔" تو امّاں چپکی چپکی رونے لگیں اور گوگو ٹیٹو بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ "ہائے پیارے بیلو تم سے یہ امید نہ تھی کہ شیر کا ناشتہ بن جاؤ گے اور ہمیں یوں اکیلا چھوڑ جاؤ گے۔"

"ہائے اللہ کیا کٹر کٹر چبایا ہوگا۔ بیچارے کو اب تک تو ہضم ہو کر آنتوں میں پہنچ چکا ہوگا۔" ننّن بھائی نے آہ بھری۔

ابّا کا بُرا حال تھا۔ وہ تو خالی ہاتھ ہی گھس کر شیر سے گتھ جانا چاہتے تھے۔ اُن کا بس نہ تھا کہ اُس کے حلق میں ہاتھ ڈال کر اپنے لاڈلے بیلو کو نکال لائیں۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے انھیں دلاسا دیا۔ بندوقیں اور لاٹھیاں لے کر سب آہستہ آہستہ بیلو کے کمرے کی طرف بڑھے۔ اندر جھانکا تو دو بڑی بڑی چنگاریاں پیڑ کے نیچے دہک رہی تھیں۔

مگر بیلو کا کہیں پتا نہیں تھا!

شیر نے ایک پھونسڑا تک نہ چھوڑا تھا۔

گھر میں کہرام مچ گیا۔ دادی اماں تو شیر کا کلّہ چیرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ بڑی مشکل سے اُسے پنجرے میں ڈالا گیا جو سرکس کے مینجر لائے تھے۔ گولی مارنے میں ایک خطرہ تھا۔ شیر کے مُنہ کو انسان کا خون لگ چکا تھا۔ اگر زخمی ہو گیا اور پلنگ کے نیچے سے ایک دم نکل پڑا تو پھر کسی کی خیریت نہیں۔

"تعجّب ہے نہ خون کے نشانات ہیں نہ ہڈّیاں ——" انسپکٹر صاحب بولے۔

"ارے وہ نگوڑا تھا ہی کتنا۔ ہائے میرا پھول بَنّو.... مزے دار تو تھا ہی جبھی تو شیر نے خون کی ایک ایک بوند چاٹ لی۔" دادی اماں کو غش آنے لگا۔

ایک دم سے مّمی آپا کی فلک شگاف چیخ فضا میں گونجی اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی آکر چوکی پر گریں۔ ...

"بی بی ..... بنّو......." جیسے اُنھوں نے بھوت دیکھا ہو۔

"کہاں کدھر——" سب نے انھیں ہلا ڈالا۔

"غو....غو...... غسل خانہ......"

اماں دوڑیں — ابّا نے لپک کر اُنھیں پکڑ لیا۔ بنّو کی کٹی پھٹی لاش دیکھ کر کہیں وہ پاگل نہ ہو جائیں۔

کلیجہ تھامے ابّا اور میوہ رام روتے بلبلاتے غسل خانے میں پہنچے۔ بنّو کی خون میں لتھڑی لاش وہاں بھی نہ تھی۔ وہ تو

گٹری سٹری بنے گھڑے کے پاس اکڑوں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

"سور پاجی ...... نامعقول ...... یہاں بیٹھا ہے گدھا۔ اور ہم ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔" ابّا نے ایک رہپٹ لگایا اور کان پکڑ کر بیلو کو اُٹھالیا۔

کہاں ماتم ہو رہا تھا کہاں ایک دم شادیانے بجنے لگے۔ سب نے بیلو کو گلے لگایا۔ اُن کے اتنے لاڈ ہوئے، اتنے صدقے اُتارے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی اللہ میاں کے ہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔ گگو اور ٹیٹو ایک دم چڑھ کر اداس ہو گئے۔ کاش شیر نے انھیں ذرا سا ہی چاب لیا ہوتا۔

اس دن سے جو بیلو کے سوراجا کے نہیں۔ ٹھاٹ سے جھوٹ بولتے ہیں۔ دھڑا دھڑ گپیں مارتے ہیں۔ کوئی دم نہیں مار سکتا۔ کسی میں اتنی ہمّت نہیں کہ انھیں جھٹلا سکے۔ اب تو اگر وہ کسی دن کہہ دیں کہ اُن کی مٹھی میں مگرمچھ ہے تو بھی اُن کو جھٹلانے کی ہمّت نہ پڑے گی۔ کیا عجب جو وہ مٹھی کھول کر مگرمچھ دکھا دیں تو کوئی اُن کا کیا بگاڑے گا۔

"بھئی ان ماسٹروں کے خوب ٹھاٹ ہیں۔ مزے سے سائیکلوں پر وندناتے پھر رہے ہیں۔ جسے جب جی چاہا ٹھوک دیا۔ مُرغا بنا کر کُرسی رکھ دی۔ اور غصّہ آیا تو کونے میں مُنہ دے کر چُھٹّی کے گھنٹے میں کھڑا کر دیا۔ کوئی جملہ پانچ سو دفعہ لکھنے کو دے دیا۔ نظمیں رٹوالیں۔"

گگّو نے ٹھنڈی سانس بھری۔ آج ان پر کلاس میں بُری بیتی تھی۔ ان پر روز ہی بُری بیتتی تھی۔ گگّو اپنی کلاس کے دادا تھے۔ ہر شرارت اُن کے زیرِ سایہ پروان چڑھتی تھی۔ ناطقہ بند تھا اُستادوں کا۔

"نہ ہوم ورک کرنا۔" ٹیٹو نے ردّا دھرا۔

"نہ جومیٹری رٹنا۔" گگّو کو جومیٹری نے بڑا ستا رکھا تھا۔ دو متوازی خطوں کے بیچ میں بننے والے زاویے برابر ہوتے ہیں۔

"ہوتے ہیں تو ہونے دو ہم کیا کریں۔" ٹیٹو نے سوچا۔

"یہ ہسٹری بھی کچھ کم بدذات نہیں۔ محمود غزنوی نے سترہ حملے کیے۔ ارے بھئی کیے تو ہم نے اُسے تھوڑی بھڑکایا تھا" ٹیکو نے جرح کی۔

"یار یہ جغرافیہ بھی فضول ہے۔ گیہوں کہاں پیدا ہوتا ہے۔ چاول کہاں اُگتا ہے۔ دریا کہاں بہتا ہے۔ پہاڑ کتنا اونچا ہے۔ سمندر کتنا گہرا ہے۔ ہُنہ یہ بھی کوئی تُک ہے۔ چاول دال سے باورچی کو دلچسپی ہوگی۔ سمندر کی گہرائی کی فکر کریں وھیل مچھلیاں۔ ہمیں کوئی سمندر ناپنے ہیں"۔

تینوں ہوم ورک کر کے بستروں پر لیٹ گئے۔ اور اس دن کے خواب دیکھنے لگے جب بجائے پڑھنے کے وہ اُستاد بن کر دوسروں کو پڑھائیں گے۔

"مزہ آجائے گا" گگو نے لڑکوں کو تخیل میں ٹھونکتے ہوئے خنخارا لیا۔ مزے سے گپیں ماریں گے۔ سینما دیکھیں گے۔ لائبریری اپنے قبضے میں ہوگی۔ کہانیوں کی کتابیں پڑھیں گے۔ کیا حسین زندگی ہوگی!

آنکھ لگی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ٹیکو لپکے کیونکہ انھیں ٹکٹ جمع کرنے کا شوق تھا اور ڈاکیے کی آواز وہ خوب پہچانتے تھے۔

"ارے گگو...... تمھارے نام رجسٹرار صاحب کا خط!"

ٹمٹو نے لفافہ لا کر دیا۔

"کھولو تو یار کس کا خط ہے"۔ ببلو نے شوق سے کہا۔

خط کھول کر جو پڑھا تو تینوں سناٹے میں رہ گئے۔ گگو تو مارے حیرت کے قلابازی کھا گئے۔ خط میں لکھا تھا۔

مسٹر گگو

واضح ہو کر آپ اسکول ٹیچر کے عہدے پر مقرر کئے جاتے ہیں۔ کل صبح پابندیٔ وقت کا خیال رکھتے ہوئے کلاس میں پہنچ کر پڑھائیے۔ ابھی نوکری عارضی ہے۔ لیاقت دیکھ کر تنخواہ مقرر کی جائے گی۔ اور آپ کو مستقل ماسٹر بنا دیا جائے گا۔

فقط....

ایک دم سے گگو اُٹھ کر ناچنے لگے۔

"آہا جی...... ماسٹر...... نوکری.... مستقل تنخواہ...."

مارے رشک کے ببلو اور ٹمٹو پست ہو گئے۔ مزے ہیں اب تو گگو کے۔ نہ ہوم ورک نہ رٹائی۔ نہ آئے دن کی سزائیں۔ رعب جھاڑنے کا موقع الگ۔

گگو اسکول جانے کی تیاری کرنے لگے۔ عید پر جو پتلون بنی تھی وہ ڈاٹی۔ منّن بھیا کا چھوٹا کوٹ انھیں مل گیا تھا۔ خوب برش سے صاف کرکے پہنا۔ جوتوں پر پالش کرکے اتنا چمکایا کہ منہ دکھائی دینے لگا۔

"ہم پہنچادیں گگو میاں ——" میوہ رام نے کہا کیوں کہ وہی تینوں کو روزانہ سائیکل پر اسکول لے جاتے تھے۔

"ہشت !" گگو نے غرور سے گردن اکڑائی۔ اب انھیں میوہ رام کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ آئینے میں دیکھ کر کنگھی کرتے وقت انھیں بڑی تکلیف ہوئی۔ کیونکہ ماسٹر تو ہو گئے تھے مگر کان پہلے سے کچھ زیادہ ہی لمبے لگ رہے تھے۔ لڑکے مذاق اڑائیں گے۔ یہ سوچ کر انھوں نے کس کر کانوں پر رومال باندھ لیا۔ کہ کچھ تو چھپے ہو جائیں۔

سائیکل پر بیٹھ کر تھوڑی ہی دُور گئے ہوں گے کہ اڑاڑا ڈا دھم! رات کو آنے جانے والوں کو گرانے کے لئے جو تیلی سی سُتلی پیڑ اور پھاٹک سے باندھی تھی وہ نظر نہ آئی اور گگو صاحب چت ہو گئے۔ جلدی سے ہڑ بڑا کر اُٹھے کسی نے دیکھا تو نہیں بھد ہو جائے گی ایک دم۔

پھر سوار ہو کر تھوڑی دور اور چلے تھے "سے فش......" اُف پنکچر ہو گیا۔ ہت تیری کی! واپس گھر جاؤ تو یا بندیٔ وقت کیسے ہو، کلاس میں دیر ہو جائے گی۔ مجبوراً سائیکل گھسیٹتے چلے اسکول۔ پسینے پسینے ہو گئے۔ اُف رومال لانا بھی بھول گئے۔ خیر شکر ہے ماسٹروں کو رومال نہ لانے پر ڈانٹ نہیں پڑتی۔ انھوں نے آستیں سے پسینہ پونچھا۔

Scanned by CamScanner

اسکول کے میدان میں بچّے بے تحاشا دوڑ رہے تھے اور غل مچا رہے تھے۔

"اہم!" رعب ڈالنے کے لئے ماسٹر گگو کھنکارے مگر کسی نے نوٹس نہ لیا۔ دو لڑکے ایک دوسرے کو دھکّے دیتے آکے ان کے پیٹ سے لڑ گئے۔

"عُنک!" دم نکل گیا گگو کا۔ جی چاہا فوراً سب کو مرغا بنا دیں۔ خیر جی کلاس میں خبر لی جائے گی سب کی۔

جیسے ہی کلاس کا دروازہ کھول کر گگو اندر داخل ہوئے سر پر ٹائیں سے ایک پانی سے لبریز ڈبّہ گرا اور گگو سر سے پیر تک شرابور ہو گئے۔

اپنی کلاس میں کئی بار گگو یہی حرکت اپنے استادوں کے ساتھ کر چکے تھے اور خوب قہقہے لگایا کرتے تھے۔ مگر آج جو ڈبّہ سر پر گرا تو مارے غصّے کے بے قابو ہو گئے۔ کلاس میں قیامت برپا تھی۔ کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی۔ لڑکے کاؤں کاؤں کئے جا رہے تھے۔

"خاموش ہو جاؤ"! انھوں نے لڑکوں کو ڈانٹیں بتائیں۔ میز کو دونوں ہاتھوں سے پیٹا، مسٹر سے کھٹ کھٹ کی۔ لڑکے ذرا سا خاموش ہوتے پھر کھی کھی کرنے لگتے۔ باوجود ضبط کے اُن کی ہنسی بار بار نکل جاتی تھی۔ "بات کیا ہے؟" گگو نے سوچا

مُڑکر جو دیکھا تو بلیک بورڈ پر گگو صاحب کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ لمبے لمبے گدھے جیسے کان، گول آلو جیسی آنکھوں پر چشمہ، نیچے لکھا تھا۔

"تختی پہ تختی...... ماسٹر جی کی کمبختی۔"

مارے غصّے کے گگو صاحب لرز اُٹھے۔ آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔

"یہ کس پاجی کی بدمعاشی ہے؟" گگو گرجے۔ مگر اُن کی آواز چیں سے ہوگئی اور لڑکے مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن گئے۔ ایک لڑکے نے ڈیسک کے نیچے منہ ڈال کر گدھے کی بولی بول دی۔ کلاس میں زوردار قہقہہ پڑا۔ گگو کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لیں یا زمین پر لیٹ کر خوب ودّٹیں لگا کر مچلیں۔ گھر میں جب وہ کبھی کوئی بات منوانا چاہتے تھے یا انھیں کوئی چھیڑ دیتا تھا تو فوراً مچل جایا کرتے تھے۔

"خاموش خاموش..... پاجیو نامعقولو..... گدھو......"

گگو کا چلّاتے چلّاتے گلا بیٹھ گیا مگر لڑکے ہنستے رہے، قہقہے لگاتے رہے، سیٹیاں بجاتے رہے کوئی بلّی کی بولی بول رہا تھا۔ کوئی کتّے کی طرح بھونکتا۔ کوئی ڈھینچو ڈھینچو کر رہا تھا تو کوئی بھینس کی طرح اڑا رہا تھا۔ ایک لڑکا اُلّو کی نقل کر رہا تھا دوسرا مرغے کی طرح اذان دے رہا تھا۔ مارے غل کے کان پڑی آواز

نہ سُنائی دیتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا چاروں طرف سے بھوت پریت نکل کر ڈرا رہے ہیں۔ کلاس نہیں چڑیا خانہ ہے۔ بھانت بھانت کا جانور موجود ہے۔ لڑکے اور بے قابو ہوئے۔ دو چار نے چاک کے ٹکڑے اور کاغذ کی گولیاں بنا کر ماریں۔ گگو ناک پکڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اتنے میں ہیڈ ماسٹر آ گئے۔ اور بچے ان کے ڈر سے خاموش ہو گئے۔ ورنہ تھوڑی دیر میں گگو صاحب کا بھرتا بنا کر رکھ دیتے۔

"آپ کیسے ماسٹر ہیں گگو صاحب آپ بچوں کو خاموش تو کرا نہیں سکتے بھلا پڑھائیں گے کیا خاک"۔ پھر وہ بچوں سے بولے۔

"بچو تم اسکول پڑھنے کے لئے آتے ہو یا غل مچانے۔ کتنی مشکل سے تمھیں اسکول میں داخلہ ملتا ہے۔ تمھارے والدین سفارشیں لا لا کر تمھیں اسکول میں بھرتی کراتے ہیں، اپنی ضرورتیں روک کر تمھاری فیس دیتے ہیں۔ کتابیں خریدتے ہیں اور تم بجائے پڑھنے کے غل مچاتے ہو۔ ہمارا بھی وقت ضائع کرتے ہو اور اپنے والدین کی گاڑھی کمائی خاک میں ملاتے ہو۔ کیوں؟...... آخر تمھیں اپنا ہی نقصان کر کے کیا فائدہ ملتا ہے۔ ہمارا ملک دوسرے ملکوں کے مقابلے میں تعلیم کے معاملے میں بہت پچھڑا ہوا ہے۔ کتنے بچوں کو یہ تعلیم میسر بھی نہیں جو تمھیں قسمت سے

مل رہی ہے۔ کاش تم بہ شوق بچّوں کے بجائے ہم اسکول میں
اُن بچّوں کو پڑھا سکتے جو علم کی نعمت سے محروم ہیں۔ کتنے دُکھ
کی بات ہے بچّو تم اپنے والدین، اپنے خاندان اور اپنے ملک
کو دھوکا دے رہے ہو۔ پڑھنے کا بہانہ کر کے تم شرارتیں ایجاد
کرتے ہو مگر وہی پُرانی سڑی ہوئی شرارتیں جن پر آج کل کے
بچّوں کو تو ہنسی بھی نہ آنا چاہیے تم دُہرائے جاتے ہو۔ تم اپنے
اُستاد کی بے عزّتی کر کے ہنس رہے ہو۔ صرف اس لئے کہ وہ اپنا
دماغ پچّی کر کے تمھیں علم کی دولت بخش رہا ہے تم اُسے سزا
دے رہے ہو۔ اُس کا کھیل بنا رہے ہو۔"

شرم سے بچّوں کے سر جھک گئے۔ سب سے نیچا سر خود گگّو
کا تھا۔ جو بات ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہی وہ خود انھیں کیوں نہ سوجھی۔
کل تک گگّو خود یہی حرکتیں کر رہے تھے۔ آج وہ نادم تھے۔
خاموشی ہوگئی تو کتاب کھولی۔ مگر پہلا ہی سبق گگّو کو خود یاد نہ تھا۔
ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کاش ابّا سے پوچھ کر پڑھ کر آئے ہوتے۔
اگر غلط سلط پڑھا دیا تو نوکری سے الگ نکال دئے جائیں گے۔
ٹیٹو اور بنیلو کے سامنے ناک کٹ جائے گی۔

گگّو تو سمجھے تھے ماسٹر بن کر پڑھائی سے چھٹّی مل جائے گی۔
معلوم ہوا کام صرف چوگنا ہوگیا۔ انھیں چار کلاسوں کے لئے
روزانہ چار سبق یاد کرنے ہوں گے۔

کسی نے پھر چاک کا ٹکڑا ناک پر مارا۔ گگو نے گھور کر دیکھا تو سب انجان بن کر بیٹھ گئے۔ جیسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ گگو نے صبر سے کام لیا۔ اُن آنسوؤں کو پی گئے جو اُن کی آنکھوں میں اُمڈ رہے تھے۔

سوال حل کرنے کے بعد چاروں طرف سے لڑکے کاپیاں لے کر پل پڑے ایسے کہ سانس لینا مشکل ہوگیا۔ لڑکوں کو تو صرف ایک ایک سوال کرنا پڑا گگو صاحب کو پینتیس لڑکوں کی پینتیس کاپیوں میں پینتیس دفعہ ایک ہی سوال کرنا پڑا کیونکہ چند ہی لڑکوں نے ٹھیک سوال کیا تھا۔ اف پینتیس لڑکے اور ایک بیچارا ماسٹر! کچومر نکل گیا۔

شکر ہے کہ اتنے میں گھنٹا بج گیا اور باقی کاپیاں گگو نے اُٹھا کر بیگ میں ڈالیں کہ گھر سے صحیح کر کے لائیں گے۔ خیال تھا آج ماسٹر بننے کی خوشی میں سینما جائیں گے مگر سب سینما وینما دھرا رہ گیا۔ اتنا کام کرنا ہوگا وہ کون کرے گا۔

دوسرے درجے میں گئے تو وہاں بھی خاصی گت بنی۔ بڑی مشکل سے پندرہ منٹ برباد کرنے کے بعد لڑکے خاموش ہوئے۔ جغرافیہ پڑھانے لگے۔ پڑھا ہوا سبق تھا بھول بھال چکے تھے۔ چپکے چپکے کتاب میں سے دیکھ دیکھ کر پڑھانے لگے۔ لڑکے بھی چالاک تھے کتاب میں سے دیکھ دیکھ کر جواب

دینے لگے۔

"اے لڑکو کتاب میں سے دیکھ کر جواب مت دو۔" گگو نے ڈانٹا۔

"ماسٹر صاحب آپ بھی تو کتاب میں سے دیکھ دیکھ کر پڑھا رہے ہیں۔"

لڑکوں نے فوراً جواب دیا اور گگو سٹپٹا گئے۔ اور بڑی مصیبت! اب گھر سے جغرافیہ بھی پڑھ کر آنا پڑے گا۔

اس گھنٹے کے بعد چھٹی تھی۔ گگو جو کلاس سے اُٹھ کر جانے لگے۔ تو کلاس کے لڑکوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ گھبرائے ہوئے غرور سے گردن اکڑائے باہر نکل آئے۔ اب یہ جدھر جاتے ہیں لوگ ہنس ہنس کر بے حال ہوئے جاتے ہیں۔ لڑکوں کو تو ڈانٹ دیا مگر جب اُستاد بھی انھیں دیکھ کر قہقہے لگانے لگے تو گگو کا خون کھول گیا۔ اور تو اور ہیڈ ماسٹر صاحب بھی گزرے تو وہ بھی مسکرانے لگے۔ گگو چکرائے۔ "یا خدا یہ کیا مصیبت ہے۔" گھبرا کر کان ٹٹولے کہ کہیں اور لمبے تو نہیں ہو گئے کیا ہو گیا کہ ہر ایک ہنسے جا رہا ہے۔

اتنے میں بیلو اور ٹینو بھی آن پہنچے۔ انھوں نے بھی بے اختیار قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔

"فوراً مرغا بن جاؤ نالائقو۔"

"ارے واہ بے کار میں مُرغا بن جائیں۔ گگوّ صاحب اینٹھ رہے ہیں۔" ٹیٹوؔ منمنائے۔

"تو کیوں ہنس رہے ہو؟" گگوّ غرائے۔

"اپنا کوٹ اُتارو۔" بیکوؔ نے رائے دی۔

"واہ جناب کیوں اُتاریں؟" گگوّ اکڑے۔

"تمھاری پیٹھ پر کچھ لکھا ہے۔" ٹیٹوؔ ہنسے۔

کوٹ اُتار کر دیکھا تو گگوّ رو دیے۔ کسی بدمعاش لڑکے نے لکھا تھا۔

"میں گدھا ہوں۔"

انٹرول میں بیکوؔ اور ٹیٹوؔ مزے سے کھڑے مونگ پھلیاں اور بیر کھا رہے تھے۔ گگوّ کے منہ میں پانی بھر رہا تھا۔ مگر بیچارے نہیں کھا سکتے تھے۔ کیوں کہ ماسٹروں کو ایسی بیہودہ چیزیں نہیں کھانی چاہئیں۔ چند ماسٹر سگریٹ پی رہے تھے۔ گگوّ نے بھی سگریٹ سُلگائی۔ خالی پیٹ میں سگریٹ کے دھوئیں سے آگ لگ گئی۔ جل کر سگریٹ پھینک دی۔ کس قدر بیہودہ چیز! اس کے مقابلے میں کھٹے میٹھے بیر اور سوندھی سوندھی مونگ پھلیاں نعمت ہیں۔ مگر جب کہ کوئی ماسٹر بیر نہیں چاب رہا تھا تو گگوّ کیسے اتنی غیر ماسٹرانہ حرکت کر سکتے تھے۔ دل پر پتھر رکھے بیٹھے رہے۔

دن نہ جانے کیسے گزرا۔ باقی گھنٹوں میں بھی لڑکوں نے اتنا ستایا اتنا کہ گگو کو چیخنا پڑا کہ گلا بیٹھ گیا، مارتے مارتے ہاتھ شل ہو گئے۔ مگر لڑکے برابر شرارت کیے گئے۔ گگو جو اپنی کلاس کے دادا، سب سے زیادہ شور مچایا کرتے تھے۔ اُنھیں اپنے اوپر ناز تھا کہ سارے ماسٹر ان کے نام سے لرزتے تھے۔ آج خود لڑکوں میں ایسے گھرے ہوئے تھے جیسے خونخوار شکاری کُتوں کے بیچ ایک زخمی خرگوش!

اسکول کے بعد گگو بالکل تھک کر چور ہو گئے تھے۔ جی چاہتا تھا گھر جا کر آنکھیں بند کر کے پلنگ پر لمبے لمبے لیٹ جائیں کبھی نہ اُٹھیں۔ مگر ابھی تو انھیں ڈیڑھ سو لڑکوں کو گیم کھلانے تھے۔ کھیل کے میدان میں لڑکے بالکل ہی بے قابو ہو گئے۔ سیٹی بجاتے بجاتے تالو چٹخنے لگا مگر لڑکے ذرا کے ذرا خاموش ہوتے پھر کاؤں کاؤں کرنے لگتے۔

ایک دم سے ایک فٹ بال آکر دھائیں سے گگو کی ناک پر لگی۔ سر جھنا کر رہ گیا، دن میں تارے نظر آنے لگے۔ ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا اور گگو چکرا کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ذرا حواس ٹھکانے ہوئے تو چاروں طرف دیکھا کہ کس نے بال ماری تھی۔ سب لڑکے نہایت معصوم صورتیں بنائے کھڑے تھے جیسے بیچاروں نے بال عمر بھر دیکھی نہ ہو۔

"کس نے پھینکی تھی بال؟" گگو غرّائے۔

"ماس صاحب ہم نے نہیں پھینکی تھی چوتھی کلاس نے پھینکی تھی۔" گگو چوتھی جماعت پر جھپٹے۔

"نہیں ماٹ صاحب ہم تو کرکٹ کی مشق کر رہے ہیں پانچویں نے پھینکی ہوگی۔"

گگو چوتھی سے پانچویں کی طرف لپکے۔ وہ بال سے کھیل ہی نہیں رہے تھے وہ تو کبڈّی کھیل رہے تھے۔

غرض اِدھر اُدھر بہت دوڑ بھاگ کی، مجرم کا پتا نہ چلا۔ اب تو گگو کا صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ سیدھے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس شکایت لے کر پہنچے۔ کہ کسی نے اُن کی ناک پر گیند ماردی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب گگو کی پکوڑا سی لال ناک دیکھ کر مسکرا دیے۔

"ارے صاحب بچے ہیں جانے دیجیے۔"

"جی ہاں بچے ہیں کہ آسیب۔ صبح سے زندگی دو بھر کر دی ہے اور آپ فرماتے ہیں جانے دیجیے۔ باز آیا میں ایسی نوکری سے۔" گگو بگڑے۔

"مگر اب تو کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اب تو ہم نے آپ کو مستقل اُستاد بنا دیا ہے۔ ایک سو پچیس ۱۲۵ روپے ملیں گے سات گھنٹے پڑھانا ہوگا۔"

"سات گھنٹے روزانہ؟ یعنی مہینے میں دو سو دس گھنٹے۔ یعنی فی گھنٹا آٹھ ۹/۱۰ نو آنے کے حساب سے۔ یعنی کہ نو آنے میں چالیس لڑکوں کو ایک گھنٹا پڑھانا۔ فی لڑکا ایک پیسے سے بھی کم۔ ......!" گگو کو چکر آگیا۔

"اس کے علاوہ ....." ہیڈ ماسٹر بولے۔

"صاحب ابھی اس کے علاوہ بھی ہے؟" گگو حیرت سے لرز اُٹھے۔

"جی ہاں کھیل اور ڈرل کی نگرانی بھی کرنی ہوگی۔"

"اُف میری ناک تو ختم سمجھو ——"

"اس کے علاوہ ...." ہیڈ ماسٹر بولے۔

"یعنی ...... یعنی ابھی اور بہت سی علاوہ ہیں؟" گگو کی آواز گلے میں گھُٹ گئی۔

"اسکول کا سالانہ جلسہ ہونے والا ہے اُس کا انتظام آپ کو ہی کرنا ہوگا...... رجسٹر تو آپ روزانہ بھر ہی لیں گے۔ امتحان آرہے ہیں۔ پرچے بنا ڈالیے گا۔ کاپیاں دیکھتے دیکھتے کئی دن لگ جائیں گے۔ لائبریری پر بھی ذرا نظر رکھنی ہوگی۔"

"مگر...... مگر صاحب...... مجھ سے اتنا کام کیسے ہوگا؟"

"ایک سو پچیس روپے تنخواہ جو ملے گی۔"

"مگر..... صاحب ایک سو پچیس یعنی فی لڑکا فی گھنٹا ایک

پیسے سے بھی کم۔ اماں کہتی ہیں نوکر ہو جاؤ گے تو اپنا خرچ خود اُٹھانا پڑے گا۔ مکان کا کرایہ، نوکروں کی تنخواہ، بھنگی بھشتی دھوبی۔ اور پھر گیہوں چاول دال ترکاری۔ اتنے لڑکوں کو پڑھانا انھیں پڑھانے کے لئے خود پہلے پڑھ کر سبق تیار کر کے لانا پھر روزانہ سائیکل میں پنکچر —— سر پر پانی بھرا ڈبّہ، کوٹ پر لکھا ہوا — "میں گدھا ہوں"۔ الجبرا...... جومیٹری...... جغرافیہ...... تاریخ اور ناک پر فٹ بال...... نا بابا بخشو چوہا لنڈورا ہی بھلا۔ میں مر جاؤں گا صاحب "۔

"مگر اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایک بار جب کسی کو ٹیچر بنا دیا جاتا ہے تو جب پنشن ملتی ہے جب ہی رہائی ملتی ہے"۔ ہیڈ ماسٹر نے بتایا۔

"کب ملے گی پنشن"۔ گگو خوش ہو گئے۔ "صاحب مجھے نوکری نہیں چاہیئے۔ مجھے صرف پنشن دے دیجیئے۔ گگو گڑگڑائے۔

"معلوم ہوتا ہے کسی نے آپ کی پیٹھ پر سچی بات ہی لکھی تھی۔ پنشن تو تیس چالیس سال بعد ملے گی آپ کو۔ پہلے نوکری تو کیجیئے۔" ہیڈ ماسٹر مسکرائے۔

"تیس ۳۰...... چالیس ۴۰...... یا پروردگار رحم"۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ گگو ایک زقند میں ہیڈ ماسٹر کے دفتر سے باہر کود گئے۔

"لینا پکڑنا جانے نہ پائے"۔ پیچھے سے لونڈوں نے دھیری

لگائی۔ مگر گگو نے ایک تڑک لگائی اور دیوار پھاند گئے۔ لڑکے کہاں چھوڑنے والے تھے۔ وہ بھی لپکے تعاقب میں۔

مگر گگو ہتھیلی پر سر رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ گھورے پر سے الانگتے پھلانگتے۔ وہ ایک گوبر کے ڈھیر پر پھسلے وہاں سے جو اُچکے تو نالی میں گرے۔ بڑی مشکل سے اُٹھ کر بھاگے تو کیلے کے چھلکوں پر پیر رپٹا۔ لڑکے کیلے، مونگ پھلیاں کھا کر میدان میں ہی سب چھلکے ڈال گئے تھے۔ پھر بھی لڑکوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ انھیں پتا چل گیا تھا کہ نئے ماسٹر صاحب بالکل گاؤدی ہیں۔ انھیں ایسے احمق ماسٹر بہت پسند تھے۔ چیختے چلّاتے وہ برابر دوڑتے چلے آرہے تھے۔

"نہ جائیے ماٹ صاحب!"

گگو نے مڑ کر دیکھا تو لڑکوں کا ایک غول اُن کے پیچھے لپکا چلا آرہا تھا۔ اُن کے ہاتھوں میں گز گز بھر کی لمبی پنسلیں تھیں۔ نیزوں برابر قلم اور گھڑے برابر دواتیں اور پلنگ برابر کتابیں تھیں۔ کُشن کے برابر ربڑ اور کھنبوں سے بھی اونچے پرکار اور فیٹے ان کے پیچھے پیچھے لمبے ڈگ مارتے چلے آرہے تھے۔ گگو کی خوف کے مارے گھگی بندھ گئی۔ وہ اور تیز بھاگے۔ دور گھنے جنگل میں جہاں کالے کالے پیڑ باہیں پھیلائے انھیں دبوچنے کو کھڑے تھے۔ ہوا سائیں سائیں پھنکار رہی

تھی۔ بچے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ پیڑوں پر سے بندر اور لنگور دانت کچکچا کر کہہ رہے تھے۔

"ہمیں پڑھاؤ ماسٹر صاحب۔ جامیٹری، الجبرا، تاریخ اور جغرافیہ پڑھاؤ۔" گگو نے بندروں سے بہت جان چھڑانا چاہی مگر دو نے اُن کے ہاتھ پکڑے دو نے پیر اور ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر چھلانگیں لگاتے اُڑانیں بھرتے وہ انھیں اپنے اسکول لے چلے۔

پیڑوں کی بلند چوٹیوں پر سے گگو نے لرز کر دیکھا نیچے لڑکے پلنگ برابر کتابیں لئے چلّا رہے تھے "آؤ آؤ ——— ہمیں پڑھاؤ ———"

"نہیں نہیں ہمیں پڑھاؤ ———" بندروں نے کہا۔

"ہم تمھیں ایک سو پچیس روپئے دیں گے" لڑکے چلّائے۔

"ہم تمھیں ایک سو پچیس ناریل دیں گے۔ تم ہمیں پڑھاؤ" بندر چیخے۔

"ہمیں مرغا بناؤ ———" لڑکوں نے کہا۔

"ہمیں بنچ پر کھڑا کر دو۔ . . . ." لنگوروں نے فرمائش کی۔ اور گگو نے بندروں کی طرف دیکھا——— پھر لڑکوں کی طرف دیکھا۔ اُن کی سمجھ میں نہ آیا وہ اُن میں سے کس کی نوکری لیں۔ بندر انھیں اور بھی اونچا لے گئے۔ گگو کا سر گھومنے لگا۔ پیڑ

گھومنے لگے، پتے اور ٹہنیاں، زمین اور آسمان سب ایک بڑے سے ہنڈولے کی طرح اوپر نیچے چکر لگانے لگے۔ ساری دُنیا گڈمڈ ہوگئی۔ لڑکوں نے نیچے اور بندروں نے اوپر بلانا شروع کیا۔ پھر لڑکوں نے تاک تاک کر روپیوں کی تھیلیاں مارنا شروع کیں۔ بندر کب چوکنے والے تھے۔ انھوں نے ایک سو پچیس ۱۲۵ ناریل ان کے سر پر مارنے شروع کر دیئے۔ نیچے سے روپیوں کی مار اور اوپر سے ناریلوں کی بوچھار گگو بے دم ہو گئے۔ اور پھر جو لنگوروں نے اپنی دُموں کو ان کے جسم کے گرد رسّیوں کی طرح لپیٹ کر ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر لمبی سی چھلانگ لگائی تو وہ بیچ ہی میں ٹوٹ گئی اور گگو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح تیرتے پتیاتے۔ سائیں سائیں پھنکارتی ہوا میں قلابازیاں کھاتے نیچے گرنے لگے۔ لڑکوں نے جلدی سے ایک کتاب کے چاروں کونے پکڑ کر پھیلادی اور گگو دھم سے اُس پر آن گرے۔

گرتے ہی اُن کی آنکھ کُھل گئی۔۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے پلنگ پر پڑے تھے اور آکہ اُن کا کندھا ہلاکر کہہ رہی تھیں۔

"کب تک سوئے گا گگو بیٹے۔ اسکول کا وقت ہو رہا ہے"۔

اس دن جب گگو اسکول گئے تو چُپ چپ تھے۔ نہ انھوں نے لڑکوں کے کہنیاں ماریں، نہ کسی کے اڑنگا لگایا۔ بلّو ٹمیٹو نے جب ان سے کہا۔

"آؤ یار آج ماسٹر کی میز میں مرا ہوا چوہا رکھیں" تو گگو ایک دم لرز کر زرد پڑ گئے۔ انھوں نے بڑی سختی سے مخالفت کی۔

"اسکول میں پڑھنے آتے ہو یا اپنا اور ماسٹروں کا وقت ضائع کرنے آتے ہو"

انھوں نے ایک لمبا لکچر دے ڈالا۔ مارے حیرت کے بیچاروں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کلاس کے دادا یہ کیسی باتیں کہہ رہے تھے!

"ہائے بیچارے گگو کو یہ کیا ہو گیا ہے؟ کہ ہر شرارت کی کاٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں"

اب جب بھی کبھی لڑکے کوئی سازش کرتے ہیں تو گگو بڑے زور شور سے انھیں روکتے ہیں۔ اپنے ڈراؤنے خواب کا وہ کبھی کسی سے ذکر نہیں کرتے۔ کہیں سب مذاق نہ اڑانے لگیں!

"بھئی جسے دیکھو انکم ٹیکس کے خوف سے مرا جا رہا ہے۔ آخر یہ ٹیکس نکالا کس نے؟"
بیلو کو آج وسیم بھائی نے پیٹتے پیٹتے چھوڑا۔ ایک تو بیچارے کا انکم ٹیکس والوں نے ناطقہ بند کر کے حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ اوپر سے بیلو کے ہاتھ سے بیڈ منٹن کا ریکٹ چھوٹ کر ان کے ٹخنے پر لگا۔ بلبلا ہی کر تو رہ گئے۔
"ضرور دادی امّاں نے ایجاد کیا ہوگا" بیلو نے فیصلہ کیا۔ وہی ایسی ان گھڑ چیزیں نکالا کرتی ہیں کہ سب کی جان آفت میں آ جائے۔ اور کچھ نہیں تو مرکھنی بھینس ہی دروازے کے پاس باندھ دی جو آتے جاتے سب پر خفا ہو کر سینگ تانتی ہے۔ امّاں سے پوچھنا تو موت کو دعوت دینا ہے۔ فوراً سوالوں کی اُلٹی بارش شروع کر دیں گی۔
"ہاتھ روم ہو آئے؟ ناک صاف کی۔ کانوں کے نیچے

صابن ملا۔ اُنہہ آخر فائدہ کیا ہوتا ہے اتنی صفائی کرنے سے پھر ناک میلی تو ہوجاتی ہے۔ وہ ویسے ہی آج تو غصّے میں بھری بیٹھی ہیں ان کی دُلائی کی گوٹ میں کان آگئی ہے۔ تخت پر صبح سے بچھائے سب سے جھگڑ رہی ہیں۔ کوئی بچّہ دور سے بھی گزر جائے تو چنگھاڑنے لگتی ہیں۔

"ٹانگیں توڑ دوں گی جو کوئی سور ادھر آیا تو۔"

کاآتاں اپنی کڑھائی میں جُٹی ہیں دین دنیا کی فکر نہیں۔ کمّی آپا؟ اوّل نمبر کی جاہل اور بد ہیں۔ کبھی سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں۔ لے دے کر ایک صوفی آلہ کا سہارا رہ گیا ہے۔ ویسے بمبئی سے پارسل بھی ڈاکٹر ممانی نے بھیجا ہے۔ ان کے پاس جانے میں فائدے ہی فائدے ہیں۔

اُن کے پاس گئے تو وہ ٹالنے لگیں۔

"بھئی انکم ٹیکس کی کہانی بڑی لمبی ہے۔ پھر کسی وقت سنائیں گے۔" انھوں نے ٹالنا چاہا مگر تینوں جان کو آگئے۔ اب تو امتحانوں کا بہانہ بھی نہیں چلے گا مجبوراً چاکلیٹ کا تازہ ڈبہ کھولنا پڑا کیوں کہ انکم ٹیکس کا پیچیدہ مسئلہ بغیر چاکلیٹوں کے کس طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

"لاکھوں برس ہوئے جب دُنیا جوان تھی ....." انھوں نے کہنا شروع کیا۔" بلکہ یہ کہنا چاہیے جب دُنیا بچّہ تھی۔"

"کیا بہت چھوٹی تھی۔" ٹیٹو بولے۔

"نہیں.... جسامت میں تو چھوٹی نہیں تھی۔ انسان موٹروں، ریلوں اور ہوائی جہازوں کی دنیا سے دُور جنگلوں میں جانوروں کی طرح رہتا تھا۔"

"صوفی آگر کیا یہ سچ ہے کہ انسان پہلے بندر تھا۔ بیلو ٹپکے بیچ میں۔

" اور کیا۔ ٹیٹو کی ناک سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اب بھی بہت سے انسان اپنے آباو اجداد سے ملتے جلتے ہیں۔"

" آں ہاں..... اور گگو صاحب کے کان بھی تو بندر جیسے ہیں۔" ٹیٹو بگڑے۔

"ہاں اور حرکتوں میں تم تینوں بندروں کے بھی کان کاٹتے ہو۔" تینوں کو چاکلیٹ دیتے ہوئے بولیں۔" مگر آہستہ آہستہ صدیاں گزرتی گئیں۔ انسان مہذب ہوتا گیا۔ ترقی کرتا گیا۔ پہلے شکار کر کے لاتا تھا۔ سب کھا کر ختم کر دیتا تھا۔ یا پھینک دیتا تھا۔ دوسرے وقت بھوک لگتی تھی تو دوسرا شکار کر لیتا تھا۔ پھر اُسے سمجھ آئی۔ اُس نے زندہ جانور پکڑ کر انھیں پالنا شروع کیا تاکہ بھوک لگے تو بجائے پھر شکار کی تکلیفیں اُٹھانے کے پلا ہوا جانور مار کر کھا لے۔ ظاہر ہے ایک جانور پورا تو ایک آدمی کھا نہیں سکتا تھا۔ بجائے سڑا کر پھینک دینے کے

اُس نے یہ کیا کہ پلا ہوا جانور مار کر اوروں کو بھی بانٹا کہ بھئی آج ہمارا جانور کل تم اپنا مارنا تو ہمیں دے دینا۔ یوں جانوروں کا گوشت برباد ہونے سے بچ رہا.... جانوروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ گلّے بن گئے۔ پھر زمانے نے اور ترقّی کی۔ انساں اناج کھاتا تھا۔ جیسے کہتے" بلیاں بھی گوشت کے ساتھ تھوڑی سبزی پیٹ صاف کرنے کو کھاتے ہیں۔ اناج کی تلاش میں اُسے جنگلوں میں جانا پڑتا تھا۔ اِس لیے اُس نے اپنے رہنے کے لیے جو گھر بنائے تھے اُن کے آس پاس ہی اناج بونے لگا۔ جنھیں ہم کھیت کہتے ہیں۔

"بڑا چالاک تھا بڈھا" گگو حیرت سے بولے۔

"ہاں .... پھر صدیاں گزریں .... انسان ترقی کرتا گیا۔ آرام کے لیے سڑکیں، تالاب، کنوئیں اور نہریں بنانے لگا۔ پہلے تو یہ ہوتا کہ جو پہلے آکر تالاب پر قبضہ کرکے بیٹھ جاتا وہ دوسروں کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ مگر پھر لوگوں نے مل کر ساجھے میں آرام کی چیزیں بنانی شروع کیں۔ لوگ اُن آرام کی چیزوں کے آس پاس ہی آکر بسنے لگے۔ ظاہر ہے۔ ان چیزوں کے بنانے میں انھیں بھی محنت دینا پڑی تھی"

"اور جو وہ نہ دیتے تو —" بیلو بڑا کاہل ہے کام کے

ذکر سے بھی جان چُراتا ہے۔

"واہ جناب محنت کیسے نہیں کریں گے۔ جو لوگ نہیں کرتے انھیں ان چیزوں کے استعمال کا بھی کوئی حق نہیں۔ فرض کرو کوئی دو دن کے لئے کسی کام سے گاؤں میں آتا... اب ظاہر ہے اُس پر پانی اور سڑک کے استعمال کا ڈنڈ پڑتا۔ کسی نہ کسی صورت میں اُسے قیمت ادا کرنی پڑتی۔"

"یہ تو ٹھیک بات تھی۔" گگّو قائل ہو گئے۔ "مگر انکم ٹیکس۔"

"آتا ہے انکم ٹیکس بھی چپکے بیٹھ کر سُنو ورنہ بھاگو یہاں سے۔"

"یہ گگّو بڑبڑ بولے چلے جاتے ہیں۔"

"آہا..... جیسے آپ تو منہ میں تالا ڈالے بیٹھے ہیں۔" گگّو چڑ گئے۔

"انھیں بکنے دیجیے، صوفی آگے تو پھر ——"

"پھر دنیا اور بڑھی —— اور بڑھی ——"

"پھر؟"

"پھر بڑے بڑے شہر آباد ہوئے... عبادت خانے بنے ..... مکتب اور پاٹھ شالے بنے .... ریلیں اور کارخانے بنے۔"

"موٹر اور ہوائی جہاز بنے ——" ٹیٹو بولے

"توپ اور گولے بنے۔"

"اُنہہ وہ تو پہلے ہی بن چکے تھے۔"

"ایٹم بم بنا ــــــ"

"صوفی آکہ یہ ایٹم بم کس بے وقوف نے بنایا؟"

"بے وقوف ہو تم جو بے سوچے سمجھے بک دیتے ہو۔ ایٹم کی طاقت معلوم کرنے والے نے ایٹم اس لئے نہیں ڈھونڈا تھا کہ اُسے انسان کو فنا کرنے میں استعمال کیا جائے۔ ایک طاقت دریافت کی تھی۔ جو بڑے بڑے کام منٹوں میں کر سکتی ہے۔"

"جادو کے زور سے۔" ٹیٹو بولے۔

"آپ تو اُلو ہیں ٹیٹو صاحب۔"

"جانتے ہو بارود سب سے پہلے کس کام میں استعمال ہوتی تھی؟"

"بم بنانے میں۔"

"بم تو کمبخت بعد میں بننے لگے پہلے تو آتش بازی میں بھری جاتی تھی۔ انار، پھلجڑیاں چھڑانے کے لئے۔ مگر لوگوں نے اس کھیل کی چیز کو موت کا فرشتہ بنا دیا۔"

"چہ چہ..... یہ تو بُرا ہوا..... ایک بم میں کتنی لاکھ پھلجڑیاں بن سکتی ہیں۔ کیوں صوفی آکہ؟"

"ہاں بھئی..... مگر انسان دشمن بم ہی بناتے ہیں۔"

"تو پھر انکم ٹیکس۔"

"اب بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ جوں جوں دنیا ترقی کرتی گئی لوگ زیادہ سے زیادہ ساجھے داری کرتے گئے۔ ساجھے سے ہی بڑی بڑی سڑکیں، نہریں، اسکول اور لائبریریاں بننے لگیں۔"

"اور سینما ہال۔"

"ہاں سینما ہال ..... اور چوں کہ چور اُچکے کاہل بھی ہوتے تھے۔ اُن سے اپنی دولت کو بچانے کے لئے چوکیدار اور پہرے دار بھی ساجھے کے رکھنے پڑے۔ پھر آئے دن جو جھگڑے ٹنٹے ہوتے تھے ان کا فیصلہ کرنے کے لئے جج مقرر ہوئے۔ کورٹ کچہریاں بنیں۔"

"سب ساجھے سے۔"

"اور کیا؟ ہر آدمی اپنا اپنا الگ کورٹ بناتا، سڑک بناتا ــــ کارخانے بناتا۔ اُن کی حفاظت بھی خود ہی کرتا ــــ اپنے بچوں کے لئے اسکول بناتا ــــ اپنی اکیلے کی الگ ریل کی پٹریاں بچھاتا تو کتنی گڑبڑ ہوتی ــــ" بیلو۔ وے ٹینو چڑھ گئے۔

"ہم تو اپنی الگ ریل گاڑی خریدیں گے۔" وہ بولے۔

"اجی ہاں...... مرجاؤ گے پوری ریل خریدو گے تو ــــ اور پھر سارے ملک میں اپنی پٹریاں بھی بچھانا ــــ ہم جناب کو اپنی پٹریوں پر نہیں چلانے دیں گے۔" گڈو نے دھمکی دی۔

"اور اپنے لئے سارے ملک میں سڑک بھی الگ بنانا ــــ ہماری سڑک پر چلے تو ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔"

"اُنہہ بھئی تم تو لڑنے لگتے ہو۔ ٹھیک تو ہے ٹینٹو ــــ تم کاہے کو سارے مُلک میں سڑکیں بناتے پھرو... چندہ دے دو۔ جیسے سب دیتے ہیں۔ ساجھے میں سب چیزیں بن جائیں گی۔"

"اچھا بھئی ہم دے دیں گے چندہ ــــ بس ؟"

"بس اس چندے ہی کو انکم ٹیکس کہتے ہیں۔ یہ چندہ جمع کرکے اس سے اسکول بنائے جاتے ہیں لائبریریاں بنتی ہیں۔"

"واہ صوفی آلہ تو ہم پھر فیس کیوں دیں۔ اسکول ہمارے چندے سے بنے ہیں تو وہ ہمارے ہیں ــــ پھر ــــ"

"اسکول بن جانے کے بعد ان پر کیا اور سالانہ خرچہ نہیں آتا؟ اُستادوں کی تنخواہیں۔ پورے عملے کا خرچ۔ پھر عمارتوں کی مرمت۔ ساری سرکاری عمارتوں کی مرمت۔ سامان ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اُس کا خرچ۔"

"پرسوں ٹینٹو صاحب نے ایک بنچ توڑ دی ہے کے۔" گگو نے شکایت جڑی۔

"واہ جناب آپ ہی نے تو دھکا دیا تھا۔ لے کے ہمارا نام لے دیا۔" ٹینٹو منمنائے۔

"خیر وہ جس نے بھی توڑی اُس کی جگہ دوسری خریدنی

پڑے گی۔ اس کے علاوہ ملک میں اور کتنے خرچ ہیں۔ ملک کی حفاظت کے لئے فوج رکھنا پڑتی ہے۔ پولیس، کچہریاں، ججوں کی تنخواہیں۔۔۔۔ لاکھوں خرچ ہیں۔ یہ سب اسی انکم ٹیکس سے پورے ہوتے ہیں۔" صوفی آکر نے بتایا۔

"فیصلوں کے لئے، ججوں کی کیا ضرورت ہے۔ خود جو فیصلہ کرلیا کریں لوگ۔"

"ٹینٹو صاحب آپ تو گدھے ہیں۔ خود ہی لوگ جھگڑا کریں خود ہی فیصلہ کریں۔ تو خوب بے ایمانی کریں گے۔" گگو نے ڈانٹا۔

"انسان جب قبیلوں میں رہنے لگے تو آپس کے جھگڑے قبیلوں کے بزرگ اور سمجھ دار لوگ چکا دیا کرتے تھے۔ مگر جوں جوں دنیا ترقی کرتی گئی کام الجھتے گئے۔ جھگڑے بھی بڑھتے گئے۔ کوئی کسی کی زمین پر قبضہ کر بیٹھتا۔ کوئی کسی کی گائیں چرا لیتا۔ یہ بزرگ گواہوں کی مدد سے مقدمے سنتے اور فیصلے کرتے۔ ان فیصلوں کو انصاف سے چکانے کے لئے قانون بنائے گئے۔ قانون کو عمل میں لانے کے لئے کچھ مضبوط بھروسے کے آدمی مقرر کئے گئے۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ فیصلہ کرتے تھے، امن قائم رکھتے تھے یا تعلیم دیتے تھے اُن کے پاس اتنا وقت نہیں رہتا تھا کہ اپنے کھانے کے لئے اناج بوئیں۔ لہٰذا دوسرے لوگوں

نے کہا " بھئی تم ہمارے یہ کام سنبھالو تمھارے خرچ کا ذمہ ہم لیتے ہیں۔ اس طرح سب اپنا کام بانٹ کر کرنے لگے۔ اس سے بہت آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ ہر شخص اپنا کام دھیان لگا کر کرنے لگا۔ ذرا سوچو تمھارے استادوں کو اگر کھیتی کرنا پڑے اور مویشیوں کی دیکھ بھال وغیرہ کا بار بھی پڑ جائے تو وہ تمھیں پڑھائیں کس وقت "

" اور جناب جج صاحب گائے دوہنے لگیں اور وہ ان کے ایک لات رسید کردے تو ساری کچہری کا بیڑا ہو جائے " بیلو نے کہا۔

" مگر وہ انکم ٹیکس کی بات تو بھول گئیں آپ " گگو نے کہا

" ارے بھئی بس سمجھ لو جو چندہ جمع کیا گیا اُسی کا نام انکم ٹیکس رکھا گیا۔

" صوفی آلہ ——" ٹیٹو بڑے فکر مند ہو کر بولے۔

" ہاں "

" یہ جو پکنک کا چندہ لیا جاتا ہے یہ بھی انکم ٹیکس ہوا "

" ہاں بھئی۔ مگر انکم ٹیکس سب سے برابر کا نہیں لیا جاتا۔"

" کیوں صوفی آلہ یہ تو سخت بے ایمانی ہے "

" جو زیادہ امیر ہیں ان سے زیادہ لیا جاتا ہے۔ جو بالکل غریب ہیں ان سے کچھ بھی نہیں لیا جاتا۔ جو درمیانہ درجے کے

ہیں اُن سے تھوڑا سا لے لیا جاتا ہے۔"

"مگر یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ کیا غریب آدمی سڑک پر نہیں چلتے۔ کیا فوج اُن کی حفاظت نہیں کرتی۔ کچہریاں ان کے فیصلے نہیں کرتیں۔ اُن کے بچّے بھی تو اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ قطعی بے ایمانی۔"

"مگر جناب امیروں کو زیادہ حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے پولیس اُن کا زیادہ کام کرتی ہے۔ غریب تو پیدل چلتے ہیں سڑک تھوڑی سی گھستی ہے۔ ان کی موٹریں دوڑتی ہیں زیادہ سڑکیں گھستی ہیں۔" بیلو نے تشریح کی۔

"موٹے بھی یہ زیادہ ہوتے ہیں۔ سڑکوں پر زیادہ بوجھ ڈالتے ہیں۔" گگّو نے کہا۔

"مگر موٹی قصائینی بھی تو موٹی ہے۔" ٹیٹّو نے احتجاج کیا۔

"موٹے دُبلے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اِنکم ٹیکس جمع کرنے کا بس یہی قانون ہے کہ جس کی جتنی آمدنی ہوتی ہے اُسی کے مطابق ٹیکس ہوتا ہے۔ تمھیں اُس دن بتایا تو تھا۔ اسی ٹیکس سے دنیا کے کام چلتے ہیں۔"

"مگر ہم تو ٹیکس نہیں دیتے صوفی آر۔"

"تم ابھی چھوٹے ہو۔ پڑھ لکھ جاؤ گے تمھیں بھی خرچے اُٹھانے پڑیں گے۔ بال بچّوں کا خرچ برداشت کرنا پڑے گا۔

پھر "چندہ" بھی دینا پڑے گا۔"

"کچھ جو اٹھائیں ہم سوروں کا خرچہ۔ پیدا ہوتے ہی مار ڈالیں گے ہم سارے بچوں کو" گگو بولے۔" اور اپنی تنخواہ کی ساری ٹافیاں منگا کر کھا جایا کریں گے۔"

"تب تو جناب کے دانت بالکل سڑ کر گر جائیں گے۔" ٹیٹو نے یاد دلایا۔" اور آپ صفا مر جائیں گے۔ اور پھر کیا آپ امّاں کو بھی نہیں دیں گے پیسے۔

"ہاں بس امّاں کو آدھے پیسے دے دیا کریں گے۔ ہیں صوفی آکر۔"

"ہاں بھئی کیوں نہیں دو گے۔ بات تو جب ہے کہ تم آج ہی سے حساب لگا کر رکھو کہ آج تک امّاں نے تمھارے اوپر کتنے روپے خرچ کئے ہیں۔ بس اتنا ہی مع سود کے دے دینا۔"

"ارے باپ رے مر گئے۔ بہت ہو جائے گا۔" گگو بڑا کنجوس ہے۔

"امّاں کو واپس دینے کی ضرورت نہیں جو تم پر خرچ ہوا ہے وہ تم اپنے لڑکے پر خرچ کر دینا۔"

"بھئی ہمارے قطعی کوئی بچہ نہ ہوگا — مر جائے گا سور ——"

"اچھا تو تم اس سور کے بچے کو دفن کر آنا اور کوئی بچہ لے کر اُس کے اوپر یہی روپیہ صرف کر دینا۔"

"اور واہ...... اور جب وہ بڑا ہو جائے گا تو وہ کسی

اور پر خرچ کر دے گا۔۔۔ پھر جب "کسی اور" بڑا ہوگا تو وہ کسی اور پر خرچ کرے گا..... یونہی "کسی اور" کا سلسلہ چلتا چلا جائے گا" بیلو چہکے۔

"ہاں..... والدین کا قرض کسی بھی ملک کے بچوں کی تعلیم پر خرچ کر کے اُتارا جا سکتا ہے۔"

"ہم تو اماں کو اپنی پوری تنخواہ دے دیں گے۔" ٹیٹو دریادلی پر اُتر آئے۔

"اور موٹی قصائینی کو بھوکا مارو گے۔" بیلو نے طعنہ دیا۔

"آں۔۔۔ دیکھئے صوفی آکہ پھر ہم انھیں ماریں گے۔"

"اچھا بھئی تم لوگ لڑو گے تو ٹھیک نہ ہوگا۔ بس اب تو انکم ٹیکس سمجھ میں آگیا۔"

"ہاں صوفی آکہ پھر تو جو لوگ انکم ٹیکس نہیں دیتے پکّے چور ہیں۔"

"اور کیا وہ لوگ ایسے ہی ہیں کہ چندہ تو نہ دیں اور پکنک پر جاکر مزے سے دوسروں کے پیسوں کا کھانا کھائیں۔ بس میں سیر کریں۔"

"مفت خورے کہیں کے۔" بیلو غرّائے۔

"بھئی ہم تو انکم ٹیکس دے دیا کریں گے۔" ٹیٹو نے فیصلہ کیا۔

"اور کیا جناب اپنے بس نہیں دیں گے۔ ہم مار مار کے وصول کریں گے۔" گگو دھمکانے لگے۔

"جی ہاں آپ کون ہوتے ہیں وصول کرنے والے۔" ٹیٹو بگڑے۔

"جناب ہم انکم ٹیکس کے افسر بن جائیں گے آئی سمجھ شریف میں۔ آپ کے اچھوں سے ٹیکس وصول کریں گے۔"

"ہم... ہم..... خود افسر بن جائیں گے جی ہاں۔" ٹیٹو جھلّا اُٹھے۔

"اور جیسے ہم تو نہیں بن جائیں گے۔" بیلو نے اطلاع دی۔

"ارے بھئی کیا مصیبت ہے۔ تم سب کے سب انکم ٹیکس میں گھس جاؤ گے تو پھر ڈاکٹر انجینیر اور پروفیسر کون بنے گا۔" صوفی آکہ نے پوچھا۔

"گگو اور بیلو بنتے ہیں تو بن جائیں۔ اپن تو صفا انکم ٹیکس افسر بن جائیں۔ ٹیکس بھی نہیں دینا پڑے گا۔"

"اُفوہ.... بھئی کیوں نہیں دینا پڑے گا؟"

"ارے واہ..... جو اُستاد فیس ہم سے لیتے ہیں انھیں تو نہیں دینا پڑتی۔"

"کافی کوڑ مغز ہو۔ تمھیں کتنی دفعہ سمجھایا کہ جس کی آمدنی ہوتی ہے اُسے ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ وہ چاہے کسی محکمے میں کام کرتا ہو"

صوفی آکہ سلگ اٹھیں۔
"اُستاد انکم ٹیکس دیتے ہیں پھر فیس کس بات کی دیں گے؟"
"ٹیٹو صاحب نرے گھونچو ہیں۔"
"آپ خود گھونچو ہیں۔"
"اہا جناب مفت کی پکنک اُڑانے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔"
"اچھا اب ٹہل جاؤ یہاں سے سر گھوم گیا ہمارا۔"
تینوں نہایت اطمینان سے باقی چاکولیٹ جیبوں میں ٹھونس کر باہر نکلے۔ سیڑھیوں پر منّن بھیّا ملک الموت کا فرشتہ بنے کھڑے تھے۔
"نکالو سیدھے ہاتھ سے۔" وہ بولے
"کیا؟" تینوں چکرائے۔
"ٹیکس اور کیا؟"
"ارے واہ ..... کیسا ٹیکس۔"
"تمھیں چاکلیٹ ملے ہیں۔ کہو ہاں۔"
"ہاں ..... مگر آپ کو کیوں دیں واہ۔"
"اچھا مت دو۔ ابھی جا کے صوفی آکہ سے ....."
"کیا کہیں گے آپ صوفی آکہ سے؟"
"کہ جو آپ نے اتنا سر مار کر سمجھایا سب اکارت۔"

"مگر......"

"ہم اگر مگر نہیں جانتے۔ دیکھو تمھاری چاکلیٹوں کی آمدنی ہوئی ہے؟ کہو ہاں"!

"ہاں......مگر......"

"بس تو تم پر ٹیکس لاگو ہوتا ہے۔ اگر نہیں دو گے تو پھر صوفی آکر سے مانگنا جوتے ملیں گے" من بھیّا نے ڈرایا۔

تھوڑی دیر تینوں پریشان کھڑے رہے۔ انھیں وسیم بھائی یاد آ گئے جو انکم ٹیکس افسر سے بچنے کے لئے ڈسٹ بن میں جا کر اوندھے مُنہ گرے تھے۔ سوچ بچار کے بعد طے ہوا کہ ٹیکس ادا کر دینے ہی میں خیریت نظر آتی ہے۔

مگر جب ٹیکس وصول کر کے من بھیّا ہنستے ہوئے ٹہل گئے تو تینوں کے دلوں میں شبہہ نے پھن اُٹھایا۔ ان کی عقل کام نہیں کرتی تھی۔ یہ ٹیکس وصول کیا گیا تھا یا کھُلی ہوئی ڈاکہ زنی تھی!

ٹہلتے ٹہلتے تینوں جا کر تاج اکبر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ آج چھٹّی کا آخری دن تھا۔ چھُٹیوں سے کچھ جی بھر چکا تھا۔ امید کے خلاف کچھ اسکول کھلنے کی ہلکی سی خوشی سی ہو رہی تھی۔ چھُٹیوں میں کرنے کے لئے دیا ہوا ہوم ورک ختم ہو چکا تھا۔ تینوں کے نئے پتلون بنے تھے۔ نئے بستے آر بمبئی سے لائی

تھیں ۔ نئی برساتیاں تھیں۔ دیکھ کر لڑکوں پر رُعب پڑ جائے گا۔ نیا کورس شروع ہوگا۔ نئے نئے لڑکے داخل ہوں گے مزہ آئے گا اُن کی فاختہ اُڑانے میں ۔ چھٹّیاں بُری نہیں گزریں۔ بھیانک قسم کی شرارتیں کرنے پر بھیانک سزائیں بھی نہیں ملیں ۔ دنیا کافی حسین تھی۔ گر ابھی بہت کام کرنا تھا سب سے پہلے تو بڑے ہونا تھا۔ بڑے ہوکر ڈیم بنانے تھے۔ ہوائی جہاز اُڑانے تھے۔ راکٹ بنا کر چاند کی سیر کے لئے پروگرام بنانے تھے۔

اور پھر جیبوں میں خوشبودار چاکلیٹ بھرنے تھے !

جو شرارتیں آج تم کرتے ہو، وہی کل ہم نے بھی کی تھیں۔ اور وہ دن بھی ایک دن آئے گا جب یہی شرارتیں تمھارے بچے کریں گے۔ انسان کی زندگی ایک درخت جیسی ہے کلّہ پھوٹتا ہے۔ پودا پروان چڑھتا ہے اس وقت وہ بالکل اناڑیوں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ کبھی ایک طرف ٹیڑھا ہونے لگتا ہے۔ کبھی دوسری طرف ضرورت سے زیادہ جھکتا ہے۔ کبھی کسی دیوار سے اَڑ کر بڑھنے لگتا ہے۔ دیوار بھی چھٹتی ہے اور اُس کا جسم بھی کُبڑا ہو جاتا ہے۔ اگر مالی ہوشیار ہو تو وہ تم لوگوں کی طرح سینہ تان کر آسمان کی طرف اُٹھتا چلا جاتا ہے اور ایک دن پھول اور پھل سے بار آور ہو کر دُنیا کو فیض پہنچاتا ہے۔

عصمت چغتائی